بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

## ''اسلامی''۔''شرعی'' کی سند دیجئے!

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ملک میں اسلام کے نام سے جو کچھ کہا اور کیا جاتا ہے اس سے قوم میں وحدتِ فکر و عمل پیدا ہونے کے بجائے اختلاف وانتشار کیوں بڑھ جاتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور گہرے غور وفکر کا متقاضی ہے۔ اسے دو ایک مثالوں سے سمجھئے۔ آپ دس ہزار کے مجمع میں بھی جب ''پانی'' کا لفظ بولتے ہیں تو ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو نہ سمجھے کہ آپ نے کیا کہا ہے یا باقی لوگوں سے کچھ مختلف سمجھے۔ یا مثلاً جب آپ ''مثلث'' کہتے ہیں تو ریاضی کا ہر طالب علم سمجھ جاتا ہے کہ آپ کا مطلب کیا ہے اور کوئی دو طالب علم بھی ایسے نہیں ہوتے جنہیں اس کے مفہوم میں اختلاف ہو۔ یہ اس لئے کہ ان الفاظ کے معانی متعین ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ اسلام' اسلامی نظام یا شریعت کے الفاظ بولتے ہیں تو کیا ان کا بھی کوئی متعین مفہوم آپ کے ذہن میں آتا ہے اور اگر آتا ہے تو کیا تمام افرادامت کے ذہن میں ان کا وہی مفہوم ہوتا ہے؟ ایسا قطعاً نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کا یا تو کوئی متعین مفہوم ذہن میں نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو ہر شخص کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرقہ سے منسلک افراد کے ذہن میں ان کا کم وبیش ایک ہی مفہوم ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ' اسلام۔ اسلامی نظام یا شریعت کا فرقے وارانہ مفہوم ہوتا ہے۔ ان کا حقیقی مفہوم نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے جو ان الفاظ سے وحدتِ فکر وعمل پیدا ہونے کے بجائے تشتت اور انتشار میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حالیہ مجوزہ ''حقوقِ نسواں بل'' کو لے لیجئے۔ انہیں اسلامی قوانین کہہ کر ملک میں نافذ کرنے کی کوشش کے پہلے ہی قدم پر اپوزیشن کے ساتھ ساتھ حکومت بھی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ آپ دیکھئے گا کہ مزید یہ اختلافات کس قدر بڑھ جاتے ہیں۔ اسی دشواری کے پیشِ نظر

ہم نے ہمیشہ یہ مشورہ دیا ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ یہ کہیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے۔ شریعت کا یہ فیصلہ ہے۔ آپ متعین طور پر کہئے کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ اس سے بات متعین اور واضح ہو جائے گی اور اسلام یا شریعت کے متعلق نہ کوئی ابہام پیدا ہوگا نہ غلط فہمی۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ طلوع اسلام' اسلامی نظام۔ اسلامی احکام۔ شرعی قوانین کے بجائے قرآنی نظام۔ قرآنی احکام اور قرآنی قوانین کیوں کہتا ہے۔ قرآن ایک واحد' متعین' منفرد کتاب ہے۔ ''قرآن'' کے لفظ سے' کتاب اللہ کے سوا کسی کے ذہن میں کچھ اور آ ہی نہیں سکتا اور جب ہم اس کے ساتھ اس کی صورت اور آیت کا حوالہ بھی دے دیتے ہیں' تو ہر شخص پرکھ سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ صدر اول میں ''اسلامی'' سے مراد تھی وہ بات (فیصلہ۔ حکم۔ قانون) جو قرآن کے مطابق ہو۔ یہی وجہ تھی کہ امت میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدی، راولپنڈی
mansoor_sarmadi@yahoo.com

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اُسی دُرج کا دُرِ مکنوں!
مکالماتِ فلاطوں نہ لِکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!

# حقوقِ نسواں بِل

انسانی بچہ جب دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو لمحہ لمحہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ بول کر اپنا مدعا بیان کرنے سے قاصر لہٰذا رو کر توجہ حاصل کرتا ہے۔ ذرا گھٹنوں کے بل چلنا شروع کرتا ہے تو ایک مصیبت کھڑی کر دیتا ہے۔ یہ اس نے مرچوں کے ڈبے میں ہاتھ مارا، وہ جلتے ہوئے چولہے کی طرف لپکا، ادھر اس نے برقی ساکٹ میں ہاتھ ڈال دیا، ادھر اس نے سکہ نگل لیا، غرض گھر کا ہر فرد اس کی ''حرکتوں'' سے نالاں ہے۔ ذرا اور بڑا ہو کر لڑکھڑا کر چلنا شروع کرتا ہے تو قدم قدم پہ گرتا ہے۔ کوئی ایک پریشانی ہو تو شمار کی جائے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی شرارتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ایسے میں دو ہاتھ آگے بڑھتے ہیں اور بچے کو تھام لیتے ہیں۔ وہ گرتا ہے تو اسے اپنی انگلی کے سہارے کھڑا کر دیتے ہیں، مرچوں والا ہاتھ آنکھوں کی طرف جانے سے پہلے ہی (Intercept) کر لیتے ہیں، برقی ساکٹ کی ''لرزہ براندامیوں'' جلتے چولہے کے دوزخ اور معدے میں جا کر سکے کی زہرناکیوں سے پہلے ہی یہ دو ہاتھ بچے کی طرف بڑھتے ہیں اور کسی 'دستِ غیبی' کی طرح اسے خطرے کے عین درمیان سے اچک لیتے ہیں۔ ذرا سوچئے! یہ دو ہاتھ اگر نہ ہوں تو انسانی بچہ شاید بڑا ہونے سے پہلے ہی دنیا کو داغِ مفارقت دے جائے۔ یہ محض دو ہاتھ ہی نہیں ہوتے، ان کے ساتھ ایک پورا جسم ہوتا ہے جس میں سوچنے سمجھنے والا ایک دماغ ہوتا ہے اور بچے کی محبت سے لبریز ایک دل۔ یہ وہی جسم ہے کہ جب رات کو بچہ بستر گیلا کر دے تو خود یہ جسم گیلی جگہ پر لیٹ جاتا ہے لیکن بچے کو

خشک جگہ پر سلاتا ہے مبادا اس کی نیند میں خلل آ جائے۔ یہ دو ہاتھ' یہ دماغ' یہ دل اور یہ جسم رکھنے والی ہستی ماں کہلاتی ہے۔ یہ ہستی ہم میں سے تقریباً ہر گھر میں موجود ہے اور جزئیات سے قطع نظر عموماً اس کی ایک جیسی کہانی ہے۔

اگر ایک نظر اس ''ماں'' کے حالاتِ زندگی پر دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جب یہ خود پیدا ہوئی تھی تو پورے گھر میں کسی کو خوشی نہیں ہوئی تھی۔ سب کے دل بجھ اور چہرے اتر سے گئے تھے۔ خیر! اس کی پیدائش کے چار پانچ سال بعد جب اس کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا تو اسے اچھی طرح یاد ہے گھر کے تمام افراد خوشی سے نہال ہو گئے تھے۔ ہر کوئی اسے اٹھانے کے لئے بے تابی کا اظہار کر رہا تھا۔ جب یہ خوشی کے چاؤ ذرا ماند پڑے تو چھوٹے بھائی کو اٹھانے کی ذمہ داری اس ''ماں'' کے نازک شانوں پہ آن پڑی۔ جب اس کے ہم عمر بچے گلی میں کھیل رہے ہوتے تو یہ بے چاری چھوٹے بھائی کو گود میں اٹھائے حسرت بھری نظروں سے انہیں کھیلتا دیکھتی رہتی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا' اسے محسوس ہونا شروع ہو گیا کہ گھر کے سب افراد اس سے کم اور اس کے بھائی سے زیادہ پیار کرتے ہیں' اس کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اس کی فرمائشوں کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ اس سلوک کی عادی ہو گئی اور ؎

**مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں**

کے مصداق اس نے پریشان ہونا چھوڑ دیا اور صورتِ حال سے سمجھوتہ کر لیا لیکن اس کی پریشانیوں کا سلسلہ رکا نہیں۔ اب اسے اپنے بھائی کے سارے کام کرنا پڑتے تھے جو خیر سے میٹرک تک پہنچ گیا تھا۔ صبح سویرے اس کا ناشتہ بنانا' اس کے جوتے پالش کرنا' اس کے کپڑے دھونا اور استری کرنا وغیرہ اب اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اسے خود تو F.A. کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی مگر چھوٹے بھائی کو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھجوانے کے منصوبے ابھی سے بنائے جا رہے تھے۔

الغرض' یہ بیٹی تھی تو باپ کی خدمت گذار' بہن تھی تو بھائیوں کی خادمہ' بیوی بنی تو شوہر کی کنیز اور ماں بنی تو بیٹوں کی خدمت گذار۔ بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اس ''راندۂ درگاہ'' کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کا کسی کو بھی احساس نہیں۔ اس کے فرائض تو سبھی کو ازبر ہیں' اس کے حقوق کسی کو یاد نہیں۔

تلاشِ معاش کی خاطر ملازمت کی غرض سے اسے دفتر جانا پڑے تو اپنے مرد رفقائے کار (Colleagues) کی چبھتی ہوئی ہوسناک نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حصولِ تعلیم کے لئے سکول جاتی ہے تو رستے میں اوباش اور لفنگے لڑکوں کے آوازے اس کے کانوں سے ٹکراتے ہیں جو اس کی روح تک کو گھائل کر دیتے ہیں۔ اس کی بے بسی' اس کی خاموشی اور اس کی مظلومیت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ؎

## مدد چاہتی ہے یہ حـــــوّا کی بیٹی
## پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی

آج سے چودہ سو سال پہلے پیغمبرِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے وحیِ خداوندی کی وساطت سے اس مظلوم و مقہور طبقے کو ظلم و استبداد کے خونی پنجوں سے آزاد کیا۔ اس کے خلاف تمام امتیازی قوانین کا خاتمہ کر دیا گیا اور انسانیت کی گاڑی مستقل اقدارِ خداوندی کے ایندھن کی طاقت سے منزلِ مقصود کی طرف تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس سے کاروانِ انسانیت کو کس قدر کامرانیاں اور سرفرازیاں ملیں، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ یہ سلسلہ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد بھی کچھ عرصہ تک قائم رہا مگر جب خلافت مبدل بہ ملوکیت ہوگئی تو انسانیت کی یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ دین اور دنیا کی ثنویت نے جنم لیا اور احبار و رہبان کا طبقہ دنیائے اسلام میں بھی پیدا ہوگیا۔ ملکی قوانین (Public Laws) اور شخصی قوانین (Personal Laws) کا تصور خود مسلمانوں کے اندر پیدا کر دیا گیا اور انہیں بالترتیب مطلق العنان بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں نے سنبھال لیا۔ خدائی قوانین کی جگہ ان مذہبی پیشواؤں کے وضع کردہ قوانین نے لے لی اور عورت بے چاری کو پھر سے جبر و استبداد کے شکنجوں میں کس دیا گیا۔ اس مرتبہ شکنجہ زیادہ مضبوط اور زیادہ سخت گیر تھا کیونکہ ان قوانین کو 'شریعت' کی آشیرباد حاصل تھی، پچھلے تیرہ سو سال سے ان خود ساختہ قوانین کی دست برد سے عورت کی روح گھائل اور وجود زخم زخم ہے۔ ظلم کی اس طویل کالی رات میں عورت کے انسانی حقوق کی بازیابی کی بے شمار کوششیں ہوئیں۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے ہے اس لئے سردست ہم قیام پاکستان سے اپنی بات شروع کرتے ہیں۔

پاکستان کے اربابِ حل وعقد نے ۱۹۵۵ء میں اس مظلوم طبقے کی حالت میں بہتری لانے کے لئے عائلی کمیشن کا تقرر کیا۔ اس پر ہمارے احبار و رہبان کا ماتھا ٹھنکا کیونکہ اس کمیشن کا دائرہ تحقیق ان شخصی قوانین (Personal Laws) کو محیط تھا جن پر صدیوں سے مُلّا کا اجارہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ عائلی کمیشن کی جانب سے جو اصلاحی قدم بھی اٹھایا گیا وہ مُلّا کی اجارہ داری کو اگر ختم نہ کر سکا تو محدود ضرور کر دے گا۔ مذہبی پیشوائیت کا ایک نمائندہ جناب احتشام الحق تھانوی صاحب عائلی کمیشن میں بطور رکن موجود تھا۔ کمیشن نے جب اپنی سفارشات مرتب کیں تو سب سے پہلے اس نمائندے نے اختلافی نوٹ لکھا۔ عائلی کمیشن کی سفارشات اگرچہ کلیتاً قرآنی تعلیمات کے مطابق تو نہ تھیں مگر پھر بھی ان کا رخ اس طرف ضرور تھا۔ ان سفارشات پر عمل کر کے پژمردہ و زبوں حال خواتین کی حالت میں بہتری لائی جاسکتی تھی مگر احبار و رہبان بھلا یہ کب گوارا کر سکتے تھے۔ ان کی بلا سے، ہزاروں بے بس و لاچار عورتوں کی زندگی جہنم میں گذرتی ہے تو گذرا کرے،

سینکڑوں خاندان تباہ ہوتے ہیں تو ہوا کریں' بے کس و بے نوا یتیم بچے اپنے جائز حق سے محروم ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو کھایا کریں اور اسلام دنیا کی نظروں میں رسوا ہوتا ہے تو ہوا کرے' ان مذہبی پیشواؤں کو اس کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں۔ انہیں یہ خطرہ ہے کہ کہیں ان کے اقتدار و اختیار میں کمی نہ آئے۔ انہیں محض اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کی فکر ہوتی ہے ؎

**دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام**
**کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے**

چنانچہ عائلی کمیشن کی اصلاحی سفارشات کے خلاف ایک ''متحدہ محاذ'' کھڑا کر دیا گیا' یوں اصلاحی سفارشات کی ناقۂ لیلیٰ ''متحدہ محاذ'' کے غبارِ راہ میں گم ہو کر رہ گئی۔

خواتین کو حقوق دینے کی دوسری کوشش ۱۹۶۱ء میں اس وقت کی گئی جب حکومت کی باگ ڈور صدر ایوب خان کے ہاتھ میں تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی حکومت کی طرف سے پہلی مرتبہ یہ اعلان کیا گیا کہ ہم عورتوں کو وہ حقوق دینا چاہتے ہیں جو انہیں قرآن نے عطا کئے ہیں۔ چنانچہ عائلی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا گیا جس میں خواتین کو بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی۔ لیکن ملت کے احبار و رہبان کو یہ کب برداشت تھا کہ کوئی ان کے دائرۂ اختیار کو چیلنج کرے۔ چنانچہ اس پر مخالفت کا طوفان برپا کر دیا گیا۔ یہ ملت کی خوش بختی تھی کہ اس وقت کے صدر نے احبار و رہبان کی مخالفت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ انہوں نے 'پاکستان ڈے' کے اپنے پیغام میں ملائیت کے اصل مرض کو طشت از بام کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ''یہ اقدام نوع انسانی کے اس مظلوم طبقہ سے عدل عمرانی کی خاطر کیا گیا ہے جسے مذہب کے مسخ کردہ نقاب کی آڑ میں' اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ اس سے مضطرب و بے قرار ہو رہے ہیں انہیں چاہئے کہ اپنے ضمیر کا جائزہ لیں اور جو جذبہ انہیں اس مخالفت پر آمادہ کر رہا ہے اور جو خواہشات اس کے پیچھے کارفرما ہیں ان کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے اپنے دلوں کو ٹٹولیں''۔

قارئین! آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان الفاظ سے مذہبی پیشوائیت پر کیا بیتی ہوگی اور وہ عائلی قوانین کی مخالفت بلکہ خاتمے کے لئے کس قدر غصے' نفرت اور انتقام کے جذبات سے لیس ہو کر کمر بستہ ہوئے ہوں گے۔

لاچار و بے بس خواتین کے خلاف اپنے انتقام کے جذبے کو تسکین دینے کا موقع ہماری مذہبی پیشوائیت کو ۱۸ سال بعد ۱۹۷۹ء میں مل گیا جب اس وقت کے صدر ضیاء الحق کو سیاسی اغراض کے لئے مذہبی پیشوائیت کے تعاون کی ضرورت پڑی۔ نام نہاد اسلامائزیشن کے نام پر حدود آرڈیننس نافذ کر دیا گیا۔ جس کی اکثر و بیشتر شقیں قرآن کی تعلیمات کے صریحاً خلاف تھیں۔ احبار و رہبان نے اس

''عظیم کارنامے'' پر ضیاء الحق کو ''مردِ مومن مردِ حق'' کا لقب دیا۔ اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد چشم فلک نے یہ مناظر بھی دیکھے کہ ہوس پرستوں کی درندگی کا شکار ہونے والی کسی عفت مآب خاتون نے حصولِ انصاف کے لئے جب عدالتی ایوانوں پر دستک دی تو اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔ چار چشم دید گواہوں جو تزکیہ شہود پر پورے اترنے والے راسخ العقیدہ مسلمان مرد ہوں اور جنہوں نے عملِ دخول(Act of Penetration) دیکھا ہو کے نہ ملنے پر پر اس خاتون کے خلاف پہلے تو تہمت کا مقدمہ درج کر کے پسِ دیوارِ زنداں کر دیا گیا۔ پھر اس کے خلاف زنا کا مقدمہ درج کر کے حدود آرڈیننس کے تقاضے پورے کئے گئے۔ وہ بیچاری نہ صرف خود برسوں جیل کی چار دیواری میں پڑی سڑتی رہی بلکہ اس درندگی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بے گناہ کی پرورش اور دیکھ بھال کا بار بھی اسی ستم رسیدہ کے کندھوں پہ آ پڑا۔ ہزاروں کی تعداد میں مظلوم و مقہور اور بے بس خواتین حدود آرڈیننس کے تحت ناکردہ گناہوں کی پاداش میں خانماں برباد ہوگئیں۔ یہ داستاں دراز بھی ہے اور دل گداز بھی' اس لئے ہم اس کو طول نہیں دینا چاہتے۔ ؎

**ہے داستاں دراز بھی اور دل گداز بھی**
**لیکن کہاں یہ دل کہ دیا جائے اس کو طول**

(ظفر علی خان)

چند ماہ قبل حدود آرڈیننس کے اسقام اور خامیوں پر ٹیلی ویژن اور اخبارات میں بحث کا آغاز ہوا۔ ہر دوسرے چینل پر مباحثے نظر آتے تھے جن میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ حصہ لے رہے تھے۔ بیشتر لوگ حدود آرڈیننس میں ترمیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ؎

**روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں**
**گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں**
**ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل**
**محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں**

مگر جب حدود آرڈیننس میں مجوزہ ترامیم کا بل ''حقوقِ نسواں بل'' کے نام سے ۲۱ اگست ۲۰۰۶ء کو قومی اسمبلی میں بحث کے لئے پیش کیا گیا تو ''مفتیانِ شرعِ مبین'' اور ''حامیانِ دینِ متین'' نے اس بل کے مسودے کو پڑھے بغیر پھاڑ کے ہوا میں اچھال دیا۔ جب اس کے ٹکڑے واپس اسمبلی کے ''فلور'' پر گرے تو انہوں نے ایک جنونی انداز میں ان کو اپنے پیروں تلے روندنا شروع کر دیا۔ یہ گویا مذہبی پیشوائیت کا بانگِ دہل اعلان ہے کہ قرآن بھلے خواتین کو حقوق دیتا رہے مگر ہم ہرگز اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ مذکورہ واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات جناب محمد علی درانی کو کہنا پڑا کہ:

''تحفظِ حقوقِ نسواں بل پر ایم ایم اے کی قیادت

نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس مقدس ایوان میں بیٹھنے کے اہل نہیں ہیں اور وہ آخری حد کی آمرانہ ذہنیت رکھتے ہیں اور لوگوں کو ان کی تعلیمی اہلیت پر شک ہونے لگا ہے۔ ایوان میں پڑھے بغیر بل کو پھاڑنا مہذب رویہ نہیں ہے اور ایسی تحریر جس میں اللہ تعالیٰ کے پاک نام کے علاوہ ۱۲ مرتبہ قرآن' ۹ مرتبہ سنتِ رسولؐ ۷ مرتبہ اسلام' ۲۷ مرتبہ حدود اللہ اور ۶ مرتبہ پاکستان کے الفاظ شامل تھے' اسے پھاڑنا اور جاہلیت کے انداز میں اسے پاؤں تلے روندنا' یہ ایسا تکلیف دہ عمل تھا جس پر وہ شرمسار ہوں یا نہ ہوں البتہ پوری قوم شرمسار ہے''۔

(روزنامہ جنگ راولپنڈی' مورخہ ۲۷ اگست ۲۰۰۶ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ ہماری مذہبی پیشوائیت آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں صدیوں پہلے تھی۔ احبار و رہبان کا جو رویہ خواتین کو بنیادی حقوق دینے کے بارے میں ۱۹۵۵ء' ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۹ء میں تھا' آج ۲۰۰۶ء میں بھی وہی ہے۔ زمانہ بدل گیا' بہت سی قومیں ازمنہ مظلمہ (Dark Ages) سے نکل کر (Enlightement) میں آ گئیں۔ کسی کے بنیادی انسانی حقوق پر مزید قدغن لگانا ممکن نہ رہا مگر ایک ہماری مذہبی پیشوائیت کا حال یہ ہے کہ ؎

**زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد**

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مذہبی پیشوائیت سے وابستہ سیاسی جماعتوں سے متعلق خواتین ارکان بھی حقوقِ نسواں بل کی مخالف ہیں۔ وہ ٹیلی ویژن کے مذاکروں اور پارلیمنٹ میں بھی اس بل کی مخالفت میں دلائل دیتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خواتین خود اس مذہبی پیشوائیت کا حصہ ہیں جو اپنے بچاؤ اور بقا کے لئے اتنے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ یہ آزاد خواتین نہیں ہیں بلکہ انہیں جماعت کی پالیسی کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ دوسرے' یہ خواتین عام طبقے سے متعلق نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی پیشوا کی بیٹی ہے تو کوئی کسی کی بہن' کوئی کسی بڑے ملا کی بہو ہے تو کوئی کسی کی قریبی رشتہ دار' فلہٰذا یہ اگر حقوقِ نسواں بل کی مخالفت کرتی ہیں تو اپنے ہی گھرانے یا خاندان کے مفاد میں ایسا کرتی ہیں۔

رہیں وہ خواتین جو سادہ لوحی یا نیک نیتی سے اس بل کی مخالف ہیں' ان کا معاملہ اور ہے۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ پنجرے میں رہنے والے پرندے یا جانور رفتہ رفتہ اس زندگی کے عادی بن جاتے ہیں۔ وہ پنجرے کو ہی آشیانہ اور مسکن سمجھ لیتے ہیں۔ اگر کبھی غلطی سے پنجرے کا دروازہ کھلا رہ جائے اور وہ باہر بھی آ جائیں تو وہ اڑ کر اپنی آزادی حاصل نہیں کرتے بلکہ واپس پنجرے میں ہی چلے جاتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے: ؎

**گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے**

حدود آرڈیننس میں مجوزہ ترامیم کی مخالفت کرنے والی سادہ

لوح خواتین کی حالت ایسے پرندوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ صدیوں کے استحصال نے ان کے تحت الشعور میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ انسانیت کی میزان میں واقعی عورت اور مرد کا وزن یکساں نہیں ہے۔ انہیں اگر کوئی قرآنی تعلیمات سے بھی قائل کرنے کی کوشش کرے تو وہ دور سے پکار اٹھتی ہیں کہ ؎

**ہمیں سکون میسر ہے ظلمتِ شب میں**
**ہمارے سامنے نورِ سحر کا ذکر نہ کر**

بات یہ نہیں ہے کہ ہمارے احبار و رہبان کو قرآن کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ دل سے انہیں بھی تسلیم ہے کہ قرآن خواتین کو ہر طرح کے بنیادی انسانی حقوق دیتا ہے۔ ان کی مخالفت کا سبب کچھ اور ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

و جحدو ابھار و استیقنتھا انفسھم ظلماً و علوا۔ فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین (۲۷/۱۴)۔

(ترجمہ) ''وہ ظلم و تکبر سے اس کا انکار کیے جا رہے ہیں حالانکہ ان کے دل اندر سے اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ تو دیکھو معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کا انجام کیا ہوا''۔

انہیں معلوم ہے کہ اگر مملکت کے قوانین اسی طرح قرآن سے اخذ کئے جانے لگے تو پھر معاشرے کو مُلّا کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جب اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تو پھر اس کی اجارہ داری بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا روزی کمانے کا ذریعہ بھی ہاتھ سے چھن جائے گا۔

آج زمانے کے تقاضے ہم سب کو کھینچ کھینچ کر قرآنی تعلیمات کی طرف لا رہے ہیں۔ ممکن ہے ان سطور کی اشاعت تک حکومتِ پاکستان 'حقوقِ نسواں بل' کو قومی اسمبلی سے منظور کروا کے ملکی آئین کا حصہ بنا دے۔ اب ملوکیت' خانقاہیت' ملائیت غرضیکہ مفاد پرستوں کی کوئی بھی طاقت زمانے کے سیل رواں کے سامنے بند باندھ کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اب یہ جوئے رواں کسی کے روکے نہیں رک سکتی مگر ہمارا قدامت پرست طبقہ اس بات پر مُصر ہے کہ دورِ ملوکیت کے وضع کردہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین (Man-made Laws) کو من وعن ماننا پڑے گا خواہ وہ کتاب اللہ کے خلاف ہی کیوں نہ جاتے ہوں۔ اس طبقۂ احبار و رہبان سے ہماری گذارش ہے کہ وہ ہوش کے ناخن لیں اور کتاب اللہ کی خواہ مخواہ کی مخالفت ترک کر دیں' اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے ؎

**ہے اب بھی وقت زاہد ترمیمِ زہد کر لے**
**سُوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تعارف

## غلام احمد پرویز

### بٹالہ/ لاہور

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش ۹/ جولائی ۱۹۰۳ء ہے۔تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور ۱۹۵۵ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائی ء اقبالؒ ہونے کے ناطے' آپ ۱۹۳۰ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

۱۹۳۷ء کے موسم گرما میں' علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیامِ شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری اقدامات کئے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دور جدید کا اجراء' مئی ۱۹۳۸ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دو قومی نظریہ'' اسلامی مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔اس دوران کانگرسی اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا' اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے' اس لئے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لئے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام

شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے، مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزمِ اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیام پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب ۱۹۴۶ء میں سرخ پوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں، پاکستان میں شمولیت/ عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی کانگرسی وزارت اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز ۳۸۔۱۹۳۷ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمتہ کے، تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظمؒ سے پیشگی وقت لئے بغیر ان کی خدمت میں، کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آ جانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا۔ پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی، پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اسکا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لئے مناسب افسروں کے انتخاب کے لئے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مردِ مجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپردِ قلم کئے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو وفات پائی۔

(بشکریہ تحریک پاکستان گولڈ میڈل ۱۹۸۹ء، شعبہ تحریک پاکستان، محکمہ اطلاعات وثقافت، حکومت پنجاب)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com

# چند غور طلب سوالات

موقر اخبار ''دی نیوز'' میں فکر انگیز مضامین طبع ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر فرخ سلیم صاحب کے مضامین کثرت سے آتے ہیں۔ جن میں ان کا موضوع عموماً اسلام کے متعلق ہوتا ہے۔ مورخہ ۱۶ مارچ کے اسی اخبار میں پروفیسر ڈاکٹر انوار الحق صاحب کا ایک مراسلہ طبع ہوا ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ انہیں ڈاکٹر فرخ سلیم صاحب کے اس مضمون سے اتفاق ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب قرآن کو چھوڑنا ہے ان کے اپنے الفاظ میں:

Because they have abandoned the Quran.

ڈاکٹر فرخ سلیم صاحب اور ڈاکٹر انوار الحق صاحب نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب قرآن کریم کو چھوڑنا ہے تو ہمارے علماء کرام اور تمام مذہبی طبقوں کا بھی یہی خیال ہے کہ قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کو زوال ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا فقرہ ہے جسے آپ بکثرت سنتے ہوں گے۔ لیکن اصل سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن کو چھوڑنے سے مسلمانوں کو زوال ہوا ہے۔ اس بات سے تو ہم میں سے ۹۰ فیصدی مسلمان اتفاق کرتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ آخر مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ کیوں دیا۔ ایک ایسی کتاب جو قوم کو عروج دینے کی خود بھی مدعی ہے اور جس نے صدر اول میں مسلمانوں کو عروج و اقتدار دیا بھی۔ جس کتاب پر عمل کرنے کے نتائج ہم نے خود دیکھ لئے پھر آخر ایسی کتاب کو مسلمانوں نے کیوں چھوڑا اور اس کو پھر دوبارہ پکڑنے میں کیا رکاوٹ ہے۔ جب ہر شخص کو مسلمانوں کے زوال کا سبب معلوم ہے تو اس کتاب کو دوبارہ کیوں نہیں پکڑ لیتے نیز یہ بات بھی خیال میں رکھیں کہ ہمارا پڑوسی ملک چین بھی تقریباً ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا ہے اس نے اس درجہ ترقی کی ہے ان کے پاس تو قرآن نہیں تھا۔ انہوں نے اس درجہ ترقی کیسے کر لی یہ تین سوالات

(۱) کہ مسلمانوں نے قرآن کو کیوں چھوڑا (۲) اب اس کے پکڑنے میں کیا رکاوٹ ہے اور (۳) چین نے بغیر قرآن پکڑے کیسے ترقی کر لی۔ نہایت قابل غور ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ ان سوالات کا جواب اس مضمون میں قارئین کے پیش خدمتِ عالی کیا جائے۔

جہاں تک قرآن چھوڑنے کے شکوہ کا تعلق ہے تو آپ ملاحظہ فرمائیں گے بظاہر ہماری زندگی میں قرآن کریم ہمارا دن رات کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مذہبی اجتماعات' روزے' نمازیں' تراویح' عید میلا دالنبی' اعتکاف' رائے ونڈ میں سالانہ اجتماع کے علاوہ سال بھر بیان اور گشت' مجالس عزا' شبرات' بائیس رجب کے کونڈے' ہزاروں تعداد میں دینی مدارس' ''علماء کرام'' کے غول کے غول' صوفیائے کرام کی فوج کی فوج' عمرے' حج' حدود آرڈیننس' اس پر مزید یہ کہ جس قدر بھی ٹی۔وی چینلز ہیں ان سب میں مذہب کا پرچار' استخارہ' نجوم' روحانی علاج' ''الف''۔ ''آغاز''۔ ''آج اور اسلام'' اور اس قسم کے بے شمار پروگرام جو مذہب کے متعلق ہوتے رہتے ہیں آپ کتابوں کی بڑی بڑی دوکانوں میں داخل ہوں زیادہ تر لٹریچر آپ کو مذہب اور خصوصاً تصوف پر نظر آئے گا۔ جتنے ماہوار رسالہ جات جاری ہیں ان میں زیادہ تر مذہبی ہیں اب تو شاید ہی کوئی ادبی رسالہ نکلتا ہوگا۔ کسی زمانہ میں شاہد احمد دہلوی کا 'ساقی' صلاح الدین احمد کا 'ادبی دنیا'۔ محمد طفیل کا سویرا اور ادب لطیف' کئی ماہوار رسالے ادب کے متعلق نکلتے تھے۔ ہماری سیاسی جماعتوں میں بھی بیشتر مذہبی لوگ نمایاں ہیں' اسی وجہ سے دو صوبوں میں ''علماء کرام'' کی حکومت قائم ہے۔ جن علماء کرام کو رائے ونڈ تک کا کرایہ نصیب نہیں ہوتا تھا' وہ آج ۵ سٹار ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں۔ نئی نسل کے نوجوان زیادہ تر مذہب گزیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد یہاں پاکستان میں بھی نوجوان ہر وقت تسبیح ہاتھ میں لئے پھرتے تھے۔ یہی حال اس زمانہ میں فوجی افسران کا تھا جس پر مرحوم علامہ احسان الٰہی ظہیر نے فرمایا تھا کہ جب جرنیل تسبیحوں کے اوراد و وظائف میں مصروف رہیں گے' تو کیا میدان جنگ میں علماء کرام جا کر لڑیں گے۔ پھر محکمہ اوقاف نے قوم کی یہ 'خدمت' کی اور اس کی یہ ''برکت'' ہے کہ جو پرانے اور بوسیدہ مزارات اور قبریں گر رہی تھیں' ان کو لیپ پوت کے پھر محفوظ کر دیا تا کہ محکمہ کی آمدنی میں کمی واقع نہ ہو۔ سالانہ عرس جو معمولی طریقے پر منعقد ہوتے تھے' اب ان پر بڑے بڑے وزراء چراغاں کرتے ہیں۔ داتا صاحب' میاں میر صاحب اور شاہ جمال صاحب کے عرس پر خود گورنر صاحب تشریف لاتے ہیں۔

جو چند امور تحریر کئے گئے ہیں وہ سب ایسے ہیں

جن میں ہمارے علماء کرام اور مذہبی حضرات Believe کرتے ہیں اور ان کو ثواب کا باعث سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ جاری بھی ہیں۔ ان سب رسوم کے ہوتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ البتہ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ سب مسلمان تہجد و اشراق کی نمازیں بھی ادا کریں۔ ہر ماہ پندرہ روز اعتکاف میں رہیں اور صرف پندرہ روز دنیاوی کاروبار میں گذاریں۔ نیچے کرتے اور اونچے اونچے پاجامے پہنیں۔ نماز میں خضوع وخشوع زیادہ کریں۔ تمام ٹی۔وی چینلز بند کر دیں۔ عورتوں کو لحافوں میں لپیٹ کر گھر کی چار دیواری میں بند کر کے دروازوں پر تالا لگا دیں تو پھر یقیناً مسلمان قرآن کو پکڑ بھی لیں گے اور انشاءاللہ ترقی بھی خوب کریں گے۔ لیکن ہم میں جو لوگ عمر رسیدہ ہیں وہ خوب اندازہ کرتے ہوں گے کہ گذشتہ بیس سال میں ہمارے ہاں جس قدر مذہب کا فروغ ہوا ہے۔ اسی قدر معاشرہ میں مصائب ونوائب کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ جن مندرجہ بالا رسومات کی ادائیگی میں جس قدر انہماک کر رہا ہے اسی قدر ہم قرآن کو چھوڑتے جا رہے ہیں اور قرآن کو چھوڑنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے ان مذہبی رسومات کو قرآن پر عمل کرنا سمجھ لیا ہے۔

قرآن کریم کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن کریم اپنے کو بطور ایک آئیڈیالوجی یا دین کے پیش کرتا ہے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ہر آئیڈیالوجی یا نظام ایک اکائی ہوتا ہے اور اس کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔ جب ایک آئیڈیالوجی یا نظام پر مکمل عمل ہوگا وہ نتائج دے گی۔ لیکن اگر اس پر جزوی عمل ہوگا یا اس میں اپنے نظریات کا اضافہ کر دیا جائے گا تو اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی ہوگا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ افتومنون ببعض الکتٰب و تکفرون ببعض فما جزاء ومن یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوٰۃ الدنیا و یوم القیمٰہ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)۔ تو پھر کیا تم (کتاب خدا کی) بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں گے ان کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو اور قیامت کے دن بڑے سخت عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ یاایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعو اخطوٰت الشیطن انہ لکم عدو مبین (۲/۲۰۸)۔ ایمان والو تم سب کے سب ایک بار اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ تمہارا یقینی ظاہر بظاہر دشمن ہے۔ ان اور اسی قبیل کی دوسری آیات

بینات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ جب تک قرآن کریم پر بطور ایک نظام یا منظّم آئیڈیالوجی یا ضابطۂ حیات کے عمل کیا جائے گا' اس کا نتیجہ سرفرازی و سربلندی ہوگا لیکن جب اس کے ایک حصہ کو تسلیم اور دوسرے حصہ کو مسترد کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خزی فی الحیٰوۃ الدنیا' دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب ہوگا۔ آخرت کا تو اس وقت علم نہیں' لیکن دنیا میں جو رسوائی ہمیں مل رہی ہے' اس سے قرآن کریم نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ صدر اول میں مسلمانوں نے قرآن کریم کو دین کی حیثیت سے قائم (Establish) کیا۔ اس کے نتائج ان کے سامنے آ گئے لیکن ہماری بدقسمتی کہ ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے دین قائم نہیں رہ سکا اور قرآن کریم مذہب کی سطح پر آ گیا اور قرآن کی تعلیم کے دو حصہ کر دیئے گئے۔ دنیاوی امور سلاطین اور بادشاہوں کے حیطۂ اقتدار میں آ گئے اور باقی امور علماء کرام کے دائرہ اثر میں چلے گئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہم مسلمان قرآن کریم پر بطور مذہب کے عمل کر رہے ہیں اور جس دن دین' مذہب میں تبدیل ہوا وہ پہلا دن تھا جب مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا تھا۔ اور اس کے بعد چونکہ قرآن پر بطور مذہب کے عمل ہو رہا ہے' اس لئے قرآن کے وعدے بھی پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ قرآن کے نتائج و ثمرات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے دوبارہ قرآن کو نہیں پکڑا۔ اب قرآن کو دوبارہ پکڑنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کو بطور دین کے جاری کیا جائے جو چیزیں آج ہم بطور مذہب کے کر رہے ہیں ان سب کو چھوڑ دیا جائے اور خالص قرآنی نظام پر عمل کیا جائے۔ جب تک ہم ان چیزوں کو قرآن کی تعلیم کے مطابق سمجھ کر' ان کو جاری رکھیں گے۔ اس وقت تک کبھی ترقی نہیں کر سکتے اور نہ قرآن کے قریب آ سکتے ہیں۔ قرآن کریم کو دوبارہ پکڑنے کا اور دنیا میں ترقی کرنے کا واحد حل اس کا نظام جاری کرنا ہے۔ ہمارا ایک ہزار سال کا لٹریچر جو تفاسیر' اصول تفاسیر' فقہ' اصول فقہ' تاریخ' حدیث' وغیرہ پر مشتمل ہے وہ سب مذہب کی ترویج و تبلیغ کرتا ہے اور دین کے تصور اور اس کی اہمیت کو محو کرتا ہے اس لئے اس کو بیک قلم مسترد کر دیا جائے۔ اس کے بجائے قرآن کریم کی وہ تفاسیر پڑھائی جائیں تو تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر تحریر کی گئی ہیں اور جو آج کے ذہن کو مطمئن کرتی ہیں اور جو اس دور کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ جن میں خارج از قرآن نظریات داخل ہو ہی نہیں سکتے اور یہ تفاسیر دین کا تصور اجاگر کرتی ہیں۔

اس کے برخلاف ہمارے علمائے کرام قرآن کو چھوڑنے کے معنے یہ لیتے ہیں کہ مسلمانوں نے عموماً عربی معاشرت کو ترک کر دیا اور انگریزی یا مقامی معاشرت اختیار کر لی ہے وہ اس کو قرآن چھوڑنا خیال کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہمارے علماء کرام لباس و ماندو بود میں حد درجہ عربی کلچر کی پیروی ضروری سمجھتے ہیں۔ علماء کرام کے علاوہ ہم میں سے جس شخص میں بھی مذہبی رجحانات پیدا ہونے لگتے ہیں وہ فوراً اپنی تراش خراش' اسی معاشرت کے مطابق کرنے لگتا ہے۔ مذہبی طبقہ کی ایک الگ معاشرت ہے' جس کو ہماری عام تعلیم یافتہ نسل اختیار نہیں کرتی۔ ہمارا مذہبی طبقہ اس معاشرت کو اختیار نہ کرنے کو قرآن چھوڑنا سمجھتا ہے حالانکہ یہ قرآن چھوڑنا نہیں ہے بلکہ قرآن چھوڑنا اس کے نظام کو چھوڑنا ہے۔ اس کے نظام کو تشکیل نہ کرنا' اور اس کے خوشگوار ثمرات و نتائج سے محروم ہونا ہی قرآن چھوڑنا ہے اور اس چھوڑنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے اللہ کی عبادت کو پرستش تک محدود کر دیا ہے حالانکہ قرآن کریم میں خدا کی عبادت کے معنے اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ولا یشرك بعبادت ربه احداً (۱۸/۱۱۰)۔ اور ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ لا یشرك فی حکمه احداً (۱۸/۲۶)۔ وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ان الحکم الا للہ (۱۲/۴۰)۔ حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اسی کے فوری ساتھ فرمایا۔ امر الا تعبدوا الا ایاہ (۱۲/۴۰)۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت و محکومیت اختیار نہ کرو۔ آپ غور فرمائیں کہ کس طرح تصریف آیات سے محکومیت اور عبادت ایک دوسرے کے ہم معنے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس موضوع کے ثبوت کے لئے متعدد آیات کریمات ہیں جن کے حوالے سابقہ مضامین میں دیئے جا چکے ہیں۔ یہاں بار بار یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہے اور اللہ کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کی اطاعت اس کی حکومت کی فرمانبرداری کرنے سے ہوتی ہے۔ اس طرح حکومت خداوندی کی اطاعت کرنے سے اللہ کے وہ سارے وعدے پورے ہو جاتے ہیں جو اس نے ہم مسلمانوں سے غلبہ و اقتدار حاصل ہونے کے کر رکھے ہیں کیونکہ اللہ کے وعدے اس کے نظام کی معرفت ہی پورے ہوتے ہیں۔ جب تک ہم مسلمان یہ نظریہ اختیار کر کے قرآن پر عمل نہیں کریں گے' ہم قرآن کو چھوڑے رکھیں گے۔

قرآن کریم کو چھوڑنے کی وجہ اور اس کو دوبارہ پکڑنے کا طریقہ کی وضاحت کے بعد اب یہ غور کرنا ہے کہ چین نے قرآن کریم پیش نظر نہ رکھنے کے باوجود کیسے ترقی کر لی؟ قرآن کریم عقل انسانی کی مخالفت نہیں کرنا بلکہ اس کی حد درجہ تعریف و توصیف کرتا ہے۔ لیکن عقل انسانی جو

ضابطۂ حیات تشکیل دیتی ہے ایک تو وہ پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نہیں ہوسکتا وہ صرف اس قوم کو ترقی دیتا ہے جس قوم نے اس کو اپنے لئے وضع کیا ہے اور وہ قوم دوسری اقوام کی سلب ونہب کو جائز سمجھتی ہے جبکہ وحی الٰہی کا عطا کردہ ضابطہ پوری انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ قرآن کریم وہ واحد کتاب ہے جس کا تخاطب پوری انسانیت سے ہے۔ اس کے ثمرات و خوشگوار نتائج سے ساری انسانیت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عقل انسانی کا طریقہ Trial & Error کا ہوتا ہے۔ وہ مختلف ضوابط بناتی ہے اور توڑتی رہتی ہے۔ جبکہ وحی الٰہی کا ضابطہ غلط نظریات سے مبرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی عقل کے وضع کردہ ضابطے پائیدار نہیں ہوتے۔ ایک دو صدیاں گذار کے ناکام ہو جاتے ہیں۔ وحی الٰہی کا ضابطہ پائیدار ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایک جیسے اور دائمی نتائج دیتا ہے۔ توتی اکلھا کل حین باذن ربھا (۱۴/۲۵)۔ قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں' ہر وقت پھل دیئے جاتا ہے۔ بشرطیکہ خالص اس ضابطہ پر عمل کیا جائے۔ اگر اس ضابطہ میں اپنے خیالات کی آمیزش کی' تو اس کا نتیجہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہے۔

چین میں خالص عقلی بنیادوں پر بنے ہوئے ضابطہ پر عمل کیا گیا۔ وہ کامیاب ہو گئے۔ ہم نے وحی اللہ کے عطا کردہ ضابطہ میں اپنے نظریات داخل کئے' اس لئے ہم ناکام ہوئے۔ اگر ہم اس میں اپنے نظریات داخل نہ کرتے تو ہم کامیاب بھی ہوتے اور ہمارا نظام ساری انسانیت کو محیط ہوتا اور سرمدی و دائمی ہوتا۔ جو نظریات ہم نے داخل کئے آپ ان کو ملاحظہ فرمائیں یہ وہ نظریات ہیں جو ہمارے زوال کا باعث ہیں اور ان کی عدم موجودگی چین والوں کی ترقی کا باعث ہے۔ ہمارے ہاں ان کی موجودگی اور چین میں ان کی عدم موجودگی کو ساتھ ساتھ ملاحظہ کرتے چلیں۔

ہمیں تصوف دیمک Termile کی طرح چاٹ گیا۔ تصوف کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ عقل انسانی سے حاصل کردہ علوم قابل بھروسہ نہیں ہوتے۔ اس لئے تصوف عقل انسانی کی حد درجہ تنقیص و تضحیک کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے عالم تصور میں حاصل کیا جائے۔ قرآن کریم نے کائنات کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بالحق پیدا کیا ہے۔ خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق ان فی ذلک لایۃ للمومنین (۲۹/۴۴)۔ اللہ نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے یوں ہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ تخلیق کائنات ایک نہایت اہم کام ہے۔ لیکن تصوف کے نزدیک اس ساری کائنات کا

وجود ہی نہیں ہے۔ جب کائنات کا وجود ہی نہیں ہے' تو اس میں Scientific Discoveries سائنسی اکتشافات کیسے ہوں گے۔ اسی وجہ سے مسلمان سائنس میں بالکل پیچھے رہ گئے۔ تصوف کا انداز کائنات کی طرف بالکل Negative (منفی) ہوتا ہے اور اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان دنیا سے بیزار رہتا ہے اور اس کے معاملات سے بے نیاز (Indifferent) ہو جاتا ہے۔ ہمارا مذہبی یا تصوف زدہ طبقہ یہ خیال کرتا ہے کہ کائنات کو تسخیر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت میں فرق آ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جب چاند پر پہلی مرتبہ انسان نے قدم رکھا یا جب Mount Everest کی چوٹی پر آدمی پہنچا' تو ہمارے ہاں پاکستان میں ان مہمات پر پہلے تو یقین ہی نہیں کیا گیا لیکن جب یہ خبر یقین کی حد تک پہنچ گئی تو اس کو بالکل Appreciate نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کو کسی درجہ سراہا گیا۔ جب پوری قوم کا کائنات کے متعلق یہ انداز ہو تو وہ قوم سائنس میں کیا اقدامات لے سکتی ہے۔ آج مسلمان سائنسی علوم میں جس درجہ پیچھے ہیں' اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف چین والوں نے سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی پر حد درجہ قابو کیا اور یہ موجودہ مقام سائنس اور ٹیکنالوجی کے قابو کرنے کی وجہ سے حاصل کیا۔ اس کے برخلاف سائنس اور ٹیکنالوجی کی پسماندگی نے مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ یہ ایک Factor ہی کسی قوم کی تباہی و بربادی کے لئے کافی ہے۔

ہر ملک میں خواتین کی آبادی تقریباً نصف کے قریب ہوتی ہے۔ جس معاشرہ میں کمانے والے افراد (Earning Members) زیادہ ہوں گے ظاہر ہے کہ وہ معاشرہ زیادہ ترقی پذیر ہوگا۔ ہمارے ہاں ملک کی نصف آبادی جو خواتین پر مشتمل ہے۔ ان میں سے زیادہ تر بیکار کر دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تمام علماء کرام' اولیاء عظام' صوفیاء' پیر' فقیہ' (مترفین) ملک کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیتے اس کے برخلاف چین کی آبادی میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ وہ کام جن میں جسمانی محنت و مشقت درکار ہوتی ہے ان میں بھی وہ مردوں کے پیچھے نہیں ہیں کیونکہ بچپن سے ان کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ مردوں کی طرح محنت و مشقت کے کام کر سکیں۔ چین میں تقریباً ۸۰ فیصدی آبادی کمانے والے افراد پر مشتمل ہے۔

جاگیرداری کی لعنت ہمارے ہاں موجود ہے۔ اس لعنت کی وجہ سے دولت کی تقسیم انصاف پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ مزدور کے لئے زندگی گذارنا مشکل ہوتی ہے اور جاگیردار اور زمیندار اس کی محنت کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ دولت کی افراط انہیں محنت کی عادت سے محروم کر دیتی

ہے اور وہ اپنی دولت کی بناء پر سیاسی زندگیاں اختیار کرتے ہیں۔ سیاست میں آ کر وہ ساری عمر ملک میں بدامنی' افراتفری پھیلاتے رہتے ہیں۔ چین میں جاگیرداری یا زمینداری کی لعنت کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہر شخص کام کرتا ہے اور سیاست میں وہ لوگ آتے ہیں جن میں سیاست کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ Grass Roots سے سیاست شروع کر کے' بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ دولت کے زور پر یا آبائی تعلقات کی بنا پر سیاست میں نہیں آتے۔

ہمارے ہاں فرقہ بندی نے ہمیں تباہ کیا اور جس قدر مذہب کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے فرقہ بندی کو بھی فروغ ہوتا جا رہا ہے۔ چین میں مذہب نہ ہونے کی وجہ سے فرقہ بندی کی لعنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرقہ بندی کا عنوان اور اس کے نقصانات اس درجہ کہ اس کے لئے بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے۔ چین اس کے تمام نقصانات سے محفوظ ہے۔

چین کی ترقی میں سب سے زیادہ اہم سبب ان کا اپنی آئیڈیالوجی سے اخلاص Devotion' اور وہاں کے لیڈروں کا اس پر عمل کرنا ہے۔ ہم تقریباً ۵۸ سال سے اپنے ملک کے لئے اپنی آئیڈیالوجی کو ہی طے (Definite) نہیں کر سکے۔ عوام جن کی اکثریت مذہبی طبقہ پر مشتمل ہے اس کے نزدیک پاکستان کی آئیڈیالوجی اسلام اور عملاً اسلامی حکومت ہے اور ان کے خیال کی رو سے پاکستان اسی لئے وجود میں آیا تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم کیا جائے لیکن اس کے برخلاف ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اور پورا Intellegentia یہاں سیکولر حکومت کا خواہشمند ہے۔ ٹی۔ وی کی مختلف چینلز پر کثرت سے اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے۔ ہر بار' ہر پروگرام میں آپ کو یہ نظریاتی اختلاف نمایاں طور پر محسوس ہوگا ان چینلز پر بھی یہ پروگرام تقریباً دس سال سے ہو رہے ہیں لیکن نتیجہ آج تک کوئی نہیں نکلا۔ دونوں طرح کے نظریات کے حامل افراد' اپنی اپنی رائے پر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں جب کہ ملک کے سامنے نہ کوئی آئیڈیالوجی ہو' نہ کسی آئیڈیالوجی پر عمل کرنے والے مخلص لیڈر' ملک کیسے ترقی کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس چین کی ایک واضح آئیڈیالوجی موجود ہے۔ خواہ وہ درست ہو یا غلط' اس کے لیڈر اس سے مخلص ہیں اور اسی وجہ سے وہ آئیڈیالوجی اپنے نتائج برآمد کر رہی ہے جو ہمارے اور ساری دنیا کے لوگوں کے سامنے رونما ہو رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کو چھوڑنے کا مطلب ہمارے علماء کرام کے نزدیک ایک خاص وضع کی معاشرت کو چھوڑنا اور نماز روزے اور دیگر رسومات کو ترک کرنا ہے۔ ان کے نزدیک جمعہ کی تعطیل' ٹی۔ وی چینلز پر اذان دینا وغیرہ بہت اہم ہیں۔ حالانکہ قرآن کو چھوڑنے کا اصل مفہوم قرآن کے نظام کو چھوڑنا ہے اور قرآن کو دوبارہ

پکڑنے کا مفہوم بھی اس کے نظام کو دوبارہ جاری کرنا ہے۔ اب یہ سوال کہ مسلمان قرآن کو دوبارہ کیوں نہیں پکڑ لیتے' اس کا عملی مفہوم یہی ہے کہ اس کا نظام دوبارہ کیوں جاری نہیں کرتے۔ اس کے نظام کو دوبارہ جاری نہ کرنے کا سبب یہی ہے کہ ہمارے علماء کرام کے سامنے نظام کا تصور ہی نہیں ہے اور جو چند تحریکات یہاں اسلامی نظام کی داعی ہیں وہ بھی مذہب کے زیر اثر اسلامی نظام کی دعوت قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں دے رہی ہیں۔ قرآن کے نزدیک تو اسلامی نظام کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے لیکن ہمارے علمائے کرام' نیز یہ قرآنی نظام کی داعی تحریکات سب اللہ کی اطاعت کے لئے قرآنی نظام کو ضروری قرار نہیں دیتی بلکہ قرآن وحدیث کی انفرادی اطاعت کو ہی عبادت خداوندی قرار دیتی ہیں۔ اس خلافِ قرآن عقیدہ کی موجودگی میں نہ قرآنی نظام قائم ہوسکتا ہے نہ ہی مسلمان قرآن کو دوبارہ پکڑ سکتے ہیں۔

دوسوالات کا جواب تو آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔

چین کی ترقی کے اسباب بھی آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ ان کا بھی اصل سبب آئیڈیالوجی کا واضح ہونا اور ان کے لیڈروں کا اس آئیڈیالوجی سے اخلاص ہے۔ تبعاً وضمناً عرض ہے کہ ہمارے برصغیر میں جب انگریزوں نے یہاں اپنے Tentacles پھیلانے شروع کئے تو ۱۸۵۷ء کے وقت میں ہمارے برصغیر پاک و ہند' بنگلہ دیش کی مجموعی آبادی ۲۰ کروڑ تھی جبکہ اس وقت انگلستان کی آبادی صرف ایک کروڑ تھی۔ لارڈ کلایو (Lord Clive) کے پاس انگریزی سپاہی صرف ۱۲۰۰ تھے۔ باقی یہاں کے ہی سپاہیوں کو وہ استعمال کرتا تھا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کا اخلاص و Devotion ہی تھا۔

ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار (۳/۱۳)۔

بے شک آنکھ والوں کے واسطے اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

**لغات القرآن**

# ق در

قـــــدر کے بنیادی معنی ہیں اندازہ۔ پیمانہ۔ قدرت الشی ء کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ماپا۔ اس کا اندازہ کیا۔ اس کی لمبائی چوڑائی جسامت' کمیت وغیرہ کو متعین کیا۔ بتایا کہ وہ کیسی ہے' کتنی ہے' اس کا تناسب کیا ہے۔ اور قدر الشیئی بالشیئی۔ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھ کر ماپا اور اس طرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں۔ یا ان دونوں کا باہمی تناسب کیا ہے۔ قدرت علیہ الثوب کے معنی ہیں اس نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے۔ قدرت علیہ الشیئی کے معنی ہیں میں نے اس چیز میں ایسی مناسب تبدیلیاں کر دیں کہ وہ اس پر بالکل فٹ آ گئی۔ لہٰذا تـــقـــدیـــر کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے مطابق بنا دینا۔ اور مـــقـــدار اس پیمانے یا ماڈل یا (Pattern) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے (تاج۔ محیط۔ لین۔ راغب)۔ قـــدر کے معنی ہیں کسی شے کا اندازہ۔ پیمانہ' حجم' جسامت۔ طول' عرض' وغیرہ۔ ھـذا قدر ھذا کے معنی ہیں یہ چیز اس دوسری چیز کے اندازے' پیمانے' جسامت' وغیرہ کے بالکل برابر ہے۔ اس کے عین مطابق ہے۔ دونوں ایک ہی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ جـــاء عـــلـــی قـــدر کے معنی ہیں وہ بالکل اندازے کے مطابق آیا اور جاوز قدرہ کے معنی ہیں اس نے اپنے اندازے' حدود' پیمانے سے تجاوز کر لیا۔ اس سے آگے نکل گیا۔ اقـــدر اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنی رفتار میں اس اندازہ اور توازن سے چلے کہ اس کے پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اس کے اگلے پاؤں پڑے تھے۔ قـــدار اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معتدل قد کا ہو۔ نہ زیادہ لمبا نہ چھوٹا۔ الـمقتدر۔ ہر چیز کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں۔ کـم قـدرة نخلـک۔ تمہاری کھجوروں کے درختوں کے درمیان کس قدر معین فاصلہ ہے (تاج۔ محیط۔ لین۔ راغب)۔ عوام کی بولی میں الـمقدر

اس شخص کو کہتے ہیں جو کھیتی اور درختوں کا اندازہ کر کے بتائے کہ غلے کی کتنی مقدار پیدا ہونے کی امید ہے۔ قدر۔ ہانڈی یا دیگ کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع قدور ہے۔ قدیر۔ اس گوشت کو کہتے ہیں جو (مناسب مسالوں کے ساتھ) ہنڈیا میں پکایا جائے۔ قدار۔ ایسا کھانا پکانے والے کو کہتے ہیں (نیز قصائی کو بھی) (تاج۔ محیط۔ لین۔ راغب)۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قدر اور تقدیر کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ۔ یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانے کے مطابق بنا دینا۔ نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا۔ متوازن اور معتدل رہنا۔ ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آ جائیں گے۔

(۲) چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو' اس لئے قدر کے معنی کسی چیز پر اقتدار و اختیار رکھنے کے بھی ہیں۔ قدرت علیٰ الشیئی کے معنی ہیں مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانے کے مطابق بنا دیتا۔ مالی علیک مقدرة (یا مقدرة۔ یا مقدرة یا قدرة) کے معنی ہیں مجھے تم پر کوئی اقتدار و اختیار حاصل نہیں۔ اس بنا پر قدر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو تیار و ہموار کرنے یا کسی معاملہ کو سرانجام دینے کے لئے اس پر غور و فکر کرنا۔ اسی سے اس کے معنی فیصلہ کرنے کے آتے ہیں (تاج۔ محیط۔ راغب)۔

(۳) ایک چیز کو آپ بغیر ناپے تولے یونہی دے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی یا فراخی کا پہلو ہوتا ہے۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں۔ اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قدر کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو ماپ تول کر دینا (تاج۔ محیط۔ راغب)۔ نیز اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یعنی جس مقام پر کوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا (تاج۔ محیط۔ راغب)۔

سورہ رعد میں ہے۔ انزل من السماء ماء فسالت اودیة بقدرھا (۱۳/۱۷) اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قدر) کے مطابق بھر کر بہ نکلتے ہیں۔ یہاں سے قدر کے معنی اندازے یعنی ظرف اور پیمانہ کے واضح ہیں۔ سورہ حجر میں ہے۔ وان من شیئی الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم (۱۵/۲۱)۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے ہاں خزانے موجود نہ ہوں لیکن ہم اسے ایک متعین اندازے اور پیمانے کے مطابق باہر لاتے رہتے ہیں۔ سورہ سبا میں ہے کہ وحشی اقوام کے کاریگر' حضرت سلیمانؑ کے لئے منجملہ دیگر اشیاء قدور راسیت

(۳۴/۱۳)۔ یعنی ایسی دیگیں جو ایک جگہ گڑی رہیں' بنایا کرتے تھے۔ یہاں قدر کے معنی دیگ کے ہیں۔

کسی پر غلبہ واقتدار حاصل کر لینے کے معنوں میں سورہ مائدہ میں ہے۔ من قبل ان تقدروا علیہم (۵/۳۴)۔ قبل اس کے کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر لو۔ سورہ انبیاء میں ہے۔ فظن ان لن نقدر علیہ (۲۱/۸۷)۔ اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر قابو نہ پا سکیں گے۔ یا اس سے کوئی مواخذہ نہ کر سکیں گے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر (۱۷/۳۰)۔ یہاں قدر۔ بمقابلہ بسط آیا ہے۔ بسط کے معنی ہیں فراخی اور کشادگی۔ لہٰذا قدر کے معنی ہیں تنگی یا کسی چیز کا ناپا تلا ملنا۔

تقدیر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عنوان (ش۔ی۔ا) میں مشیت کے معنی دیکھئے اور ان تینوں گوشوں پر غور کیجئے جن کا وہاں ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ گوشۂ اول وہ ہے جہاں امر الٰہی کے مطابق ہر شے وجود میں آتی ہے اور اس کے لئے قواعد وضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں۔ یہی قواعد وضوابط و خواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ انہی کو ان کی ''تقدیریں'' کہا جاتا ہے۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیال ہے' نشیب کی طرف بہتا ہے' ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے اور جب اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے۔ سورہ فرقان میں ہے خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا (۲۵/۲)۔ اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر ان کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دیئے۔ امام راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اشیاء کے متعلق تقدیر الٰہی (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو تاوقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے۔ (جیسے سمٰوات) اور دوسری یہ کہ کسی شے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی۔ جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔

امام راغب نے جو پہلی بات کہی ہے (کہ بعض چیزوں کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکی ہیں) سو وہ جس زمانے میں گذرے ہیں اس میں وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ

تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر تقدیر کے معنی ہیں کسی شے کو ترقی دیتے ہوئے اس قدر (Pattern) کے مطابق بنا دینا جو اس کے لئے متعین ہے۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities) کا مشہود (Actualise) ہو جانا اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا۔ مقدور۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنے پیمانے کے مطابق سامنے آتی رہے۔

قرآن کریم میں حضرت موسےٰؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طُور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لئے) بلایا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یونہی اتفاقیہ نہیں مل گئی کہ۔۔ آگ لینے کو آئے پیمبری مل جائے۔۔ اس کے لئے تمہیں شروع سے تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اس طرح تم مدین کی طرف آئے۔ اس طرح وہاں تم نے گلہ بانی کی۔ اس طرح تمہاری تربیت ہوئی۔ اور یوں ان مختلف منازل میں سے گذر کر ثم جئت علی قدر یموسیٰ (۲۰/۴۰)۔ تم 'اے موسیٰ! اس اندازے پر پہنچ گئے۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے جو نبوت کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا (واضح رہے کہ حضرت موسےٰؑ کو اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ انہیں کن مراحل میں سے گذارا جا رہا ہے اور کس مقصد کے لئے گذارا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نبی کو نبی ہونے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ نبوت وہبی ہوتی ہے۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔) یہاں لفظ قدر نے اپنا مفہوم بالکل واضح کر دیا۔

سورۃ اعلیٰ میں ہے۔ الذی خلق فسویٰ۔ و الذی قدر فھدیٰ (۸۷/۲۰۳)۔ اللہ وہ ہے جو مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق کرتا ہے۔ پھر ان میں مناسب اعتدال پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کے لئے ان کے پیمانے اور اندازے مقرر کرتا ہے اور ان کی اس راستے کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ ان پیمانوں اور اندازوں کے مطابق بن جائیں۔ یہ ہے خدا کا نظام ربوبیت جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تقدیر تک پہنچتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے اندر بھی کچھ بننے کی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن اسے دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور نہیں کر دیا گیا کہ وہ صرف اس راستہ پر چلے جس پر چلنے سے اس کی یہ تمام صلاحیتیں نشو و نما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے اور چاہے دوسرا راستہ جس

سے اس کی یہ صلاحیتیں دب کر رہ جائیں۔ ان دونوں راستوں میں امتیاز' وحی کی رو سے ہوتا ہے۔ (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے)۔ اب انسان جو راستہ اختیار کرے گا' یا اس راستے میں جس مقام پر ٹھہر جائے گا' اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا۔ جس طرح مثلاً جب تک پانی سیال رہتا ہے تو اس پر سیالیت (Liquidity) کا قانون نافذ رہتا ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو پھر جمادیت (Solidity) کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان جو کچھ بننا چاہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ ابتداء (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع (Follow) کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم۔ (۶۱/۵)۔ جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ دوسری جگہ ہے۔ یوفک عنہ من افک (۵۱/۸)۔ اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے۔ یعنی انسان جو راستہ اختیار کرتا ہے' اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ انسان کی ممکنات (Realisable Possibilities) کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس لئے اس کے لئے تقدیرات (یعنی قوانین خداوندی) کے انتخاب کا میدان بھی لامحدود ہے۔ یہ جیسا خود بن جائے گا ویسی اس کی ''تقدیر'' بن جائے گی۔ اقبال کے الفاظ میں:۔

حرفے باریکش بہ رمزے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذر ہوا سازد ترا
سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی! افتندگی تقدیر تست
قلزمی! پائندگی تقدیر تست

تم اگر کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانون خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں تو تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لو۔ اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہو جائے گا اور تمہاری تقدیر بدل جائے گی۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر
خواہ از حق حکم تقدیرے دگر
تو اگر تقدیر نو خواہی روا است
زانکہ تقدیرات حق لا انتہا است

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقدیر کا مفہوم۔ لہٰذا جب کہا جائے گا کہ ان اللہ علیٰ کل شیئ قدیر۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون ہر شے پر

حاوی اور غالب ہے اور اس شے کو اس کی آخری منزل تک لئے جا رہا ہے۔ انسان بھی جس مقام پر اپنے آپ کو رکھے گا اس کے مطابق خدا کا قانون (تقدیر) اس پر حاوی ہوگا۔ اب یہ بات انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس مقام پر رکھنا چاہتا ہے' اور اس طرح خدا کی کون سی تقدیر اپنے لئے منتخب کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مقام پر رکھے' خدا کی تقدیر (قانون) سے اپنے آپ کو باہر نہیں لے جا سکتا۔ ان اللہ علیٰ کل شیی ء قدیر۔

قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شے کے لئے پیمانے (قوانین' اندازے' تناسب' توازن) مقرر ہیں' علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبردار ہے۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشفات قدم قدم پر اس کی شہادت بہم پہنچا رہی ہیں کہ کائنات میں قانون کی کارفرمائی ہے۔ یونہی اندھیر گردی نہیں۔ یعنی تمام کائنات (Rational Basis) پر چل رہی ہے۔ آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو اور (Ratio) قدر' پیمانے' اندازے' تناسب ہی کو کہتے ہیں۔ و کان امر اللہ قدرا مقدورا (۳۳/۳۶) اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے۔ یہاں ہر بات (Rational) ہے۔ اندھی فطرت (Blind Nature) کارفرما نہیں۔ نہ ہی انسان مجبور اور مقہور ہے۔ ''پہلے سے لکھا ہوا'' صرف قانون ہے (کہ فلاں عمل کا نتیجہ یہ ہوگا)۔ انسان کی ''قسمت'' نہیں۔ اپنی قسمت ہر انسان (خدا کے قانون مکافات کے مطابق) خود بناتا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قانون خداوندی کو قرآن کریم نے قدر کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قوانین جس طرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں (جنہیں قوانین فطرت یا Laws of Nature) کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہیں۔ مستقل اقدار (Permanent Values) خدا کے یہی غیر متبدل قوانین ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ نزول قرآن کریم سے مقصد یہ تھا کہ نوع انسان تک ان مستقل اقدار کو پہنچا دیا جائے۔ اسی وجہ سے نزول قرآن کریم کی ''رات'' کو لیلۃ القدر کہا گیا ہے (۳-۱/۹۷)۔ وہ ''شب'' (یا تاریک زمانہ جس میں وحی کی روشنی کہیں موجود نہیں تھی) جس میں دنیا کو نئی اقدار عطا ہوئیں۔ یہ مستقل اقدار ہی ہیں جن کے احترام اور پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے بلند ہو کر' انسانیت کی سطح پر آتا ہے' اور جب کسی مستقل قدر اور طبعی (حیوانی) زندگی کے تقاضا میں تصادم ہوتا ہے (Tie پڑتی ہے) تو وہ طبعی زندگی کے تقاضا کو' بلند قدر کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ عند الضرورت' جان تک کو بھی۔ دین' نام ہی قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

# شرعی سزائیں

تعزیرات کے باب میں سب سے پہلے اس قاعدۂ کلیہ کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اور دوسری شرعی حدیں صرف اسی جگہ نافذ کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم ونسق اسلامی اصولوں پر ہو اور تمدن و معاشرت کی ترتیب وتنظیم اس طرز پر کی گئی ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اسلام کے اصول اور قوانین ناقابل تجزیہ ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض اصول اور قوانین تو نافذ کئے جائیں اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ مثلاً زنا اور قذف کی حدود کو لیجئے۔ (قذف سے مراد کسی عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگانا ہے اور قازف وہ شخص جو ایسی تہمت لگائے۔) نکاح وطلاق اور حجابِ شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاقِ صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ان حدود کا نہایت گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے زانی اور قازف کے لئے ایسی سخت سزائیں مقرر ہی اس سوسائٹی کے لئے فرمائی ہیں جس میں عورتیں بن سنور کر بے محابانہ پھرتی ہوں، جس میں برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں اور عشق ومحبت کے افسانے اور شہوانی جذبات کو دائماً متحرک کرنے والے تماشے رائج نہ ہوں، جس میں نکاح کے لئے پوری آسانیاں ہوں، اور فسخ وتفریق اور طلاق وخلع کے اسلامی احکام ٹھیک ٹھیک نافذ کئے جاتے ہوں۔ ایسی سوسائٹی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس میں معاشرت کا جو معتدل نظام قائم کیا گیا ہے اس کی حفاظت کے لئے سخت سزائیں مقرر کی جائیں اور اتنی سخت سزائیں اس حالت میں ہرگز نامنصفانہ نہیں ہیں جبکہ جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین آسان کر دی گئی ہو اور معاشرت کے ماحول کو بدکاری کی سہولتوں اور غیر معمولی اسبابِ تحریک سے پاک کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں صنفی جرائم کا ارتکاب صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غایت درجہ کے بدطینت ہوں اور جن کے شر سے خلق اللہ کو محفوظ رکھنے کے لئے نہایت عبرت ناک سزاؤں کے بغیر چارہ نہ ہو۔

لیکن جہاں حالات اس سے مختلف ہوں، جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں، خلوت اور جلوت میں ہر جگہ جہاں مردوں اور بنی ٹھنی عورتوں کو

آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو۔ جہاں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور ازدواجی رشتے کے بغیر خواہشات کی تسکین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی موجود ہوں، جہاں معیارِ اخلاق بھی اتنا پست ہو کہ ناجائز تعلقات کو کچھ بہت معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، ایسی جگہ زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں ایک معمولی قسم (Normal Type) کے معتدل مزاج اور سلیم الفطرت آدمی کا بھی زنا سے بچنا مشکل ہے اور ایسے حالات میں کسی شخص کا مبتلائے گناہ ہونا یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی قسم (Abnormal Type) کا اخلاقی مجرم ہے اور کوڑوں کی سزا درحقیقت ایسے گندے حالات کے لئے اللہ نے مقرر ہی نہیں کی ہے۔

اسی پر حد سرقہ کو بھی قیاس کر لیجئے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لئے مقرر کی گئی ہے جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں۔ قطع ید اور اسلامی نظمِ معیشت میں ایسا رابطہ ہے جس کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں یہ نظمِ معیشت قائم ہو وہاں قطعِ ید ہی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے اور جہاں یہ نظمِ معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے۔ حقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا، اس ظالم سوسائٹی کے لئے مقرر ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جائز ہو، زکوٰۃ متروک ہو، انصاف قیمتاً فروخت کیا جاتا ہو، ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریاتِ زندگی نہایت گراں ہوگئی ہوں، اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کے لئے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہوگی۔

عام طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کو سمجھنے میں لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیشِ نظر تو رکھتے ہیں سوسائٹی کے اس غلط نظام کو جو اس وقت دنیا کے متمدن ممالک میں قائم ہے اور پھر چوری، زنا، قذف اور شراب نوشی جیسے ''عامتہ الورود'' جرائم کا موازنہ قطعِ ید، رجم اور کوڑوں کی سزاؤں سے کر کے رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موزانہ میں ان کو اسلام کی سزائیں سخت اور ہولناک ہی نظر آئیں گی کیونکہ نیم شعوری طور پر وہ خود سمجھتے ہیں کہ جو حالات اس نظامِ حیات نے پیدا کر رکھے ہیں ان میں چوری ایک عام چیز ہونی ہی چاہئے۔ زنا میں بکثرت مردوں اور عورتوں بلکہ بچوں اور بوڑھوں تک کو مبتلا ہونا ہی چاہئے۔ آئے دن مشتبہ طریقوں سے ملنے والے جوڑوں کے متعلق بری خبریں مشہور ہونی ہی چاہئیں۔ بری صحبتوں میں نوخیز نسلوں کو بری عادتیں پڑنی ہی چاہئیں۔ لہٰذا ان کا دل یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اگر ان حالات میں اسلامی قانونِ فوجداری رائج کر دیا جائے تو شاید کوئی پیٹھ بھی کوڑوں سے نہ بچ سکے، ہزارہا آدمیوں کے

ہاتھ روزانہ کٹنے لگیں اور ہر روز سینکڑوں آدمی سنگسار کئے جائیں۔

بلاشبہ ان کا یہ خوف بالکل بجا ہے۔ اس بے ہودہ سوسائٹی کے بے ہودہ نظام کو باقی رکھ کر اسلام کے قوانین میں سے محض اس کے قانونِ فوجداری کو نافذ کر دینا ہمارے نزدیک بھی ویسا ہی ظلم ہوگا جیسا وہ خیال کرتے ہیں۔ مگر جس غلطی کو وہ محسوس نہیں کرتے وہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سوسائٹی کے اس بے ہودہ نظام کو، جس کی بے ہودگیوں سے وہ مانوس ہو چکے ہیں ایک فطری حالت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ فطری حالت نہیں ہے، بلکہ شیطنت کے غلبہ نے اس غیر فطری حالت کو عالمِ انسانی پر مسلط کر دیا ہے، اور اس حالت کا باقی رہنا بجائے خود ایک ظلمِ عظیم ہے۔ آپ اسلام کے نظامِ اجتماعی کو من حیث الکل قبول کر کے اس ظلم کا انسداد کیجئے۔ پھر آپ پر خود روشن ہو جائے گا کہ زنا اور قذف اور چوری اور شراب نوشی انسان کے عام اور فطری مشاغل نہیں ہیں اور انسانوں کی کثیر تعداد کا ان میں مبتلا ہونا متوقع ہی نہیں ہے۔ جو اجتماعی حالات اسلام پیدا کرتا ہے ان میں صرف غیر معمولی قسم کے چند افراد ہی ان افعالِ قبیحہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور ان کے لئے صحیح تدارک رجم اور کوڑے اور قطعِ ید ہی ہو سکتے ہیں۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ ص ۸۳۔ ۲۸۰۔ اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

☆☆☆

(۲) مودودیؔ صاحب اپنے مندرجہ بالا مقالہ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانونِ فوجداری کی دفعات اس مملکت کے لئے ہیں جس میں پورا اسلامی نظامِ زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لئے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی سزا اسلام کی قانون سے لے لی جائے۔ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے، اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو، اور یہ قطعی ظلم ہے، اگر ملک میں اسلام کے منشا کے خلاف سود حلال اور زکوٰۃ متروک ہو اور حاجتمند انسان کی دستگیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص صرف اتنی سی بات نکال لے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔''

(رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ ص ۱۹۔ ۱۸۔ اشاعتِ اول)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومت اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی

ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دے دے' تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شارب خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دے گا وہ تو ظالم نہیں ہوگا' البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعتِ الٰہیہ کے ایک حصے کو معطل اور دوسرے حصے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایسی حکومت کو اس آیتِ قرآنی کا مصداق سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے: افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض۔ فما جزاء من یفعل ذالک منکم الاخزی فی الحیوٰۃ الدنیا و یوم القیمٰۃ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)۔ ''کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسری حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو' پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور روزِ قیامت وہ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں۔'' ..... جہاں تک میں نے شریعت کو سمجھا ہے اس کے نظام میں اصلاح' سدِ بابِ ذرائع اور تعزیر کے درمیان ایک مکمل توازن قائم کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ ہر پہلو سے تزکیۂ اخلاق اور تطہیرِ نفوس کی تدابیر ہمیں بتاتی ہے' دوسری طرف وہ ایسی ہدایات ہمیں دیتی ہے جن پر عمل درآمد کر کے ہم بگاڑ کے اسباب کی روک تھام کر سکتے ہیں' اور تیسری طرف وہ تعزیرات کا ایک قانون ہمیں دیتی ہے تاکہ تمام اصلاحی و انسدادی تدابیر کے باوجود اگر کہیں بگاڑ رونما ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا تدارک کر دیا جائے۔ شریعت کا منشا اس پوری اسکیم کو متوازن طریقے سے نافذ کر کے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے کسی جز کو ساقط اور کسی کو نافذ کرنا حکمتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواز میں یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ جس جز کو ہم نافذ کر رہے ہیں اس کے نفاذ کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ اس استدلال کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکیم حاذق کا نسخہ کسی اناڑی کے ہاتھ آ جائے اور وہ اس کے بہت سے اجزاء میں سے صرف دو چار اجزاء نکال کر کسی مریض کو استعمال کرائے اور اعتراض کرنے والے کا منہ بند کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کرے کہ جو اجزاء میں استعمال کرا رہا ہوں وہ سب حکیم کے نسخے میں درج ہیں۔ اس کی اس دلیل کا جواب آخر آپ یہی تو دیں گے کہ بندۂ

خدا حکیم کے نسخے میں جو مصلحات اور بدر قے درج تھے ان سب کو چھوڑ کر تو صرف سمیات مریض کو استعمال کرا رہا ہے اور نام حکیم کا لیتا ہے کہ میں اس کے نسخے سے علاج کر رہا ہوں۔ حکیم نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرے نسخے میں سے جس جز کو چاہے چھانٹ کر نکال لے اور جس مریض کو چاہے کھلا دے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شریعت آیا اپنے نفاذ کے لئے مومن و متقی کا رکن چاہتی ہے یا فاسق و فاجر لوگ اور وہ لوگ جو اپنے ذہن میں اس کے احکام کی صحت کے معتقد تک نہیں ہیں؟ اس معاملے میں بھی محض جواز اور عدمِ جواز کی قانونی بحث مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ مجرد قانونی لحاظ سے ایک کام جائز بھی ہو تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکمتِ دین کے لحاظ سے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کیا حکمتِ دین کا یہ تقاضا ہے کہ احکامِ شرعیہ کا اجراء ایسے حکام کے ذریعہ سے کرایا جائے جن کی اکثریت رشوت خور، بدکردار اور خدا و آخرت سے بے خوف ہے اور جن میں ایک بڑی تعداد عقیدتاً مغربی قوانین کو برحق اور اسلامی قوانین کو غلط اور فرسودہ سمجھتی ہے؟

میرے نزدیک تو اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کر دینے اور خود مسلم عوام کو بھی اسلام سے مایوس کر دینے کے لئے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں احکامِ شریعتِ جاری کرائے جائیں۔ اگر چند بندگانِ خدا پر بھی جھوٹے مقدمے بنا کر سرقے اور زنا کی حد جاری کر دی گئی تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں حدودِ شرعیہ کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور دنیا میں یہ چیز اسلام کی ناکامی کا اشتہار بن جائے گی۔''

(رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم۔ اشاعتِ اول، ص ۲۷۸۔۲۷۴)

☆☆☆

ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ احکامِ شریعت کو فوراً نافذ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مودودیؒ صاحب لکھتے ہیں:

''اب اگر ہم اسلامی قانون کو ازسرِنو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں، بتدریج ہی ہو گی۔'' (ایضاً ص ۲۵۲)۔

☆☆☆

مودودیؒ صاحب کی ان تصریحات کی روشنی میں، فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مملکتِ پاکستان کے حالات ایسے ہیں کہ یہاں قوانینِ شریعت فوری طور پر نافذ ہو سکیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com

# ''حدود اللہ''

پاکستان میں حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء میں جاری کئے گئے تھے، اس وقت سے لے کر آج تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان قوانین کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے۔ ان قوانین کی بیشتر دفعات عقل عامہ (Common Sense) اور قرآنِ کریم کے خلاف ہیں۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے خلافِ قرآن ہونے کے باوجود ہمارا ''علماء'' کا طبقہ اس کے ساتھ ہے۔ اب تک ان قوانین کے خلاف کوئی موثر آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ مقام شکر ہے کہ ٹی۔ وی کے مشہور چینل ''جیو'' نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور گیارہ جون ۲۰۰۶ء کو اپنے چینل میں ایک لائیو مذاکرہ منعقد کیا۔ جس میں معروف علماء نے حصہ لیا۔ مجموعی طور پر چند باتوں پر اتفاق بھی ہوا لیکن افسوس کہ ''رجم'' اور زنا کی شہادت میں چار گواہوں کی شرط کو باقی رکھا گیا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ یہ قوانین اس درجہ خلاف قرآن ہیں کہ ان کو فوراً منسوخ کر دینا چاہئے تھا۔ تاہم اس مباحثہ میں جو کچھ معمولی سی ترامیم پیش کی گئیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ اس قدر معمولی سی ترامیم کی بنا پر ہی مذکراہ کے بزرگ ترین عالم دین سخت برہم ہوئے اور مذاکرہ کے نہایت سمجھدار دونوں کمپیئرز نے ان کو قابو میں رکھا لیکن انہوں نے جس برہمی کا مظاہرہ فرمایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کرام میں رواداری کا اس درجہ فقدان ہے کہ وہ ایک بات بھی اپنے مزاج کے خلاف سننے کو تیار نہیں ہیں اور اس عدم رواداری کے بارے میں وہ خود کو یہ فریب دے لیتے ہیں، کہ وہ یہ سب کچھ حمیتِ اسلام کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ ان مولانا صاحب نے نہایت ناراضگی سے یہ فرمایا کہ ہم حدود اللہ کی ہر حالت میں حفاظت کریں گے اور انہیں کسی حال میں بھی تبدیل نہیں ہونے دیں گے۔ بعد میں اخبارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء کرام نے حدود اللہ کی حفاظت کے بارے میں ایک تحریک چلانے کا بھی اعلان کیا ہے۔ یہ مختصر سا خط حدود اللہ کی وضاحت کے بارے میں طلوع اسلام کو ارسال کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین اس کو ملاحظہ فرما سکیں۔

قرآنِ کریم میں 'حدود اللہ' کے الفاظ کم و بیش

چودہ مقامات پر آئے ہیں۔ ہمارے علماء کرام حدود اللہ کے جو معنے لیتے ہیں وہ مذہب کی رو سے لیتے ہیں۔ دین کی رو سے حدود اللہ کا جو مفہوم ہے وہ پیش خدمت ہے۔

''حد'' کے لغوی معنے روکنے کے ہیں۔ جو دو چیزوں کے درمیان ایسی روک ہو جو ان دو چیزوں کو باہم ملنے سے روک دے۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ بعض نے حدود کے معنے احکام کئے ہیں اور بعض نے کہا کہ حقائق و معانی مراد ہیں۔ امام راغب نے جملہ حدود الٰہی کو ۴ قسم پر محمول فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

(۱) ایسے حکم جن میں کمی و زیادتی دونوں ناجائز ہوتے ہیں' جیسے فرض نمازوں میں تعداد رکعات کو جو شارع علیہ السلام نے مقرر کر دی ہیں۔ ان میں کمی و بیشی قطعاً جائز نہیں ہے۔

(۲) وہ احکام جن میں اضافہ تو جائز ہو' لیکن کمی جائز نہ ہو۔

(۳) وہ احکام جو اس دوسری صورت کے برعکس ہوں یعنی ان میں کمی تو جائز ہے لیکن ان پر اضافہ جائز نہیں ہے۔

(۴) اور آیۂ کریمہ ان الذین یحادون اللہ و رسولہ (۵۸/۲۰)۔ جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں' میں یحادون اللہ و رسولہ کے معنے اللہ و رسول کی مخالفت کے ہیں''۔

(مفردات القرآن۔ جلد دوم۔ ص ۲۱۷)۔

آپ کو امام راغب کی اس تصریح سے بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا کہ امام صاحب موصوف کے نزدیک حدود صرف وہ سزائیں ہی نہیں ہیں جن کو ہمارے علماء کرام حدود قرار دیتے ہیں بلکہ دین میں تو قرآنِ کریم کے پورے پورے احکام حدود اللہ کیے جاتے ہیں۔ یہ صرف سزاؤں تک محدود نہیں ہوتے۔ قرآن کریم نے حدود اللہ کی اصطلاح اکثر ان مقامات پر استعمال فرمائی ہے' یہاں سزاؤں کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔ ان میں سے چند مقامات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

(۱) کفارہ سے متعلق احکام کو حدود اللہ کہا گیا ہے۔ (۵۸/۴)۔

(۲) احکام طلاق بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ حدود اللہ ہیں' ان سے تجاوز نہ کرنا۔ (۲/۲۲۹)۔

(۳) وراثت کے احکام بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ حدود اللہ ہیں' ان سے تجاوز نہ کرنا۔ (۱۴-۱۳/۴)۔

(۴) روزوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ حدود اللہ ہیں' ان کے قریب نہ جانا۔ (۲/۱۸۷)۔

(۵) حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا' خود اپنے پر زیادتی کرے گا' اللہ کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا۔ (۶۵/۱)۔

ان مندرجہ بالا آیات سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ حدود اللہ صرف بدنی سزائیں نہیں ہیں' بلکہ جیسا

کہ امام راغب نے لکھا ہے قرآنِ کریم کے احکامات ہی حدود اللہ ہیں۔ دین میں تو حدود اللہ کا مطلب اعمال کا وہ دائرہ ہے جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے لیکن جس سے تجاوز کرنا قطعی طور پر منع ہے۔ حدود اور اصول و احکامات ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں' چونکہ یہ احکام وقوانین (حدود) وحی الٰہی نے مقرر کئے ہیں اس لئے ان سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں۔ ومن یتعد حدود اللہ فاؤلئک ھم الظٰلمون (۲/۲۲۹)۔ اور جو کوئی تجاوز کرے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی ظالم ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ تلک حدود اللہ فلا تقربوھا (۲/۱۱۸)' یہ اللہ کی حدیں ہیں' جن کے قریب نہ جانا۔

(۱) قرآن کریم کی سب سے اہم حد یہ ہے کہ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے' حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی زیب دیتا ہے۔ لا یشرک فی حکمہٖ احداً (۱۸/۲۶)۔ اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ نیز یہ کہ طاغوت میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ (۴/۶۰)۔

(۲) قرآن کریم کی اہم ترین حد یہ ہے کہ ربٰو حرام ہے اور ربٰو کھانا اللہ و رسول کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ (۲/۲۷۹)۔

(۳) قرآن کریم کی نہایت اہم حد یہ ہے کہ فرقہ بندی حرام ہے اور شرک ہے (۳۰/۳۲)۔ جو کوئی فرقہ بندی کرتا ہے اس کا رسول اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہتا (۶/۱۵۹)۔ اور اس موضوع پر بہت سی آیات ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں تو بہت حدود اللہ ہیں۔ آپ غور فرمالیں کہ ہمارے علماء کرام ان حدود کی طرف کوئی توجہ نہیں فرماتے۔ قبلِ قیام پاکستان' علماء کرام کا بیشتر حصہ' متحدہ ہندوستان میں رہنے کے لئے تیار تھا۔ اور طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرنے پر آمادہ تھا۔ کیا یہ حدود الٰہی کی کھلی کھلی مخالفت نہیں تھی۔ اب ہمارا سارا معاشی نظام سودی نظام ہے بلکہ ہماری فقہ کا تو مدار ہی سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام خالص ربٰو ہے۔ تحریک طلوع اسلام سے پیشتر آپ ڈیڑھ ہزار سال کا سارا مذہبی لٹریچر نہایت غور سے کھنگال ڈالیں۔ اس سارے لٹریچر میں آپ کو ایک لفظ فرقہ بندی کے خلاف نہیں ملے گا۔ طلوع اسلام نے فرقہ بندی کے خلاف نہایت بلند آواز اٹھائی' چونکہ اس بارے میں آیاتِ قرآنی بہت واضح ہیں اس لئے ہمارے علماء کرام کے پاس اس کے متعلق کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ فرقہ بندی کا جواز بھی کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تاویلات کرنی شروع کر دیں کہ یہ فرقہ بندی نہیں ہے صرف مکاتب فکر کا اختلاف ہے۔ لیکن حقیقت کبھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ ہمارے ہاں کئی سال سے فرقہ بندی کی وجہ سے قتل ہوتے چلے جا رہے ہیں اور فرقہ بندی نے اس درجہ شدت اختیار کی کہ خود علماء کرام فرقہ

بندی کا اعتراف اور اس کو برا کہنے پر مجبور ہو گئے' لیکن ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ خود فرقہ بندی کی پیداوار ہوتے ہیں وہ صرف اس کو زبانی طور پر برا کہہ سکتے ہیں عملاً کوئی اقدام لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیا فرقہ بندی حدالٰہی سے کُھلی ہوئی بغاوت نہیں ہے؟؟

ہمارے یہی علماء کرام جو حدودِ الٰہی کے تحفظ کی تحریک چلانے کا اعلان کر رہے ہیں وہ خود ان سب حدود کی مخالفت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان حضراتِ کرام کی کیفیت حضرت عیسیٰؑ کی اس مثال کے مانند ہے جس میں انہوں نے اپنے مخالفین کے متعلق فرمایا تھا کہ تم اونٹ کو تو نگل جاتے ہو' اور مچھر کو چھان چھان کے پیتے ہو۔

حدود اللہ کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا ہے یہ دین کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور یقیناً ان کا تحفظ کرنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے' لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو افسوس صد افسوس کہ یہی حدود اللہ صرف سزاؤں تک محدود ہو گئیں۔ مذہب میں' یعنی ہماری فقہ میں حد قرآن کریم کی مقرر کردہ سزا کو کہتے ہیں اور ہمارے علماء کرام صرف ان کے تحفظ پر ہی اصرار کرتے ہیں' چونکہ ان کے سامنے دین نہیں ہے اس لئے وہ ان حدود کی پروا بھی نہیں کرتے جو دین میں اہمیت رکھتی ہیں اور جن میں سے صرف تین کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ حدود کا اجراء صرف اسلامی حکومت میں ہی ممکن ہے۔ ان کا اجراء و نفاذ غیر اسلامی حکومت میں نہیں ہو سکتا اور اسلامی حکومت کی تعریف Definition بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک وہ حکومت جس کے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں اور اس میں اسلامی فقہ جاری ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کی انفرادی طور پر براہ راست اطاعت ہو رہی ہو' تو وہ اسلامی حکومت ہے۔ اس میں انفرادی طور پر نماز ادا ہو سکتی ہے اور انفرادی طور پر زکوٰۃ بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اس میں ذاتی نیک عملیاں بھی سرانجام دی جا سکتی ہیں لیکن اس تمام کے برخلاف قرآنِ کریم کی رو سے اسلامی حکومت وہ ہوتی ہے جس کا آئین خود قرآن ہوتا ہے' اُس میں براہ راست اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ اس میں اطاعت خداوندی کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جس کی اطاعت بمنزلہ ''اللہ و رسول'' کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس قرآنی حکومت کی اطاعت ہی عبادتِ الٰہی ہوتی ہے۔ اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ صرف حکومت کی وساطت سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس حکومت کے احکامات قرآنی معروف اور اس کے جرائم قرآنی منکر ہوتے ہیں۔ اس طرح کی اسلامی حکومت اور صرف اس طرح کی اسلامی حکومت میں حدود کا اجراء ہو سکتا ہے باقی سب بُتانِ آذری۔

وآخر دعوٰنا ان الحمدللہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نذیر ناجی

# حکومت اور اپوزیشن کی بے بسی

جو کچھ شہنشاہ آریا مہر نے ایران میں کیا' وہی کچھ پاکستان میں ہمارے مغربی مہربان اور غیر منتخب حکمران کر رہے ہیں۔ شاہ ایران نے مغربی طرز کی معاشرتی آزادیوں کو مسلط کرتے وقت مقامی تہذیب' روایات اور اعتقادات کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اقتدار کو تحفظ دینے کے لئے مقبول اور منتخب سیاسی راہنما ڈاکٹر مصدق اور دیگر سیاستدانوں اور ان کی جماعتوں پر پابندیاں لگا دی تھیں اور ملاؤں کو معصوم اور بے غرض سمجھ کر کھلی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ مساجد میں جیسے خیالات کا چاہیں' پرچار کریں۔ آنکھیں اس وقت کھلیں' جب بازی ہاتھ سے نکل گئی۔ ملاؤں نے اچانک سیاسی میدان میں کود کر وہ خلا پر کر دیا' جو ڈاکٹر مصدق اور دیگر سیاسی قوتوں کو کچل کے پیدا کیا گیا تھا اور اس کے بعد شاہ ایران' اس کی فوج اور خفیہ ایجنسی ساواک کچھ نہ کر سکیں اور امریکہ اور ان کے دوسرے مغربی سرپرست بھی کسی کام نہ آئے۔ ایران پر آج تک ملاؤں کی حکومت ہے اور امریکہ کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے۔

پاکستان میں بھی غیر منتخب حکمرانوں اور ان کی ایجنسیوں نے مذہبی سیاستدانوں کو بے ضرر اور سادہ لوح سمجھ کر سیاسی میدان میں اپنے حلیفوں کی حیثیت سے آگے بڑھایا۔ ان کی سرپرستی کی اور ملک کے مقبول سیاسی لیڈروں اور ان کی جماعتوں کو بے اثر کرنے کے لئے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں انہیں ناقابل یقین انتخابی کامیابی دلوائی اور آج یہی مذہبی سیاستدان ان کی حکومت کو ناکوں چنے چبوا رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے پارلیمنٹ میں بھی بیٹھے ہیں۔ جمہوریت کے فائدے بھی اٹھا رہے ہیں اور ان کے ہتھیار بند کارندے پاکستان کے قبائلی علاقوں سے لے کر افغانستان تک ہر جگہ مسلح طاقت کے مظاہرے بھی کر رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ایسا وقت دور نہیں' جب پاکستان اور افغانستان دونوں مذہبی سیاستدانوں کے شکنجے میں ہوں گے۔ جمہوری آزادیاں ختم ہو جائیں گی۔ سول سوسائٹی کا خاتمہ ہوگا۔ مہذب زندگی کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ ایران کے ملا تو پھر قدیم تہذیبی ورثے کے مالک ہونے کی وجہ سے تمدنی روایات کو جانتے ہیں اور سائنسی و دیگر دنیاوی علوم سے استفادہ کرنے کے قائل ہیں لیکن جن

مذہبی سیاستدانوں سے ہمارا واسطہ ہے' وہ قبائلی پس منظر رکھتے ہیں۔ تہذیب و تمدن ان کے قریب سے نہیں گزرے۔ سائنسی علوم کے دشمن ہیں۔ جدید زندگی کی سہولتوں سے خود تو استفادہ کرتے ہیں لیکن عام آدمی کو اس سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ خود ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اپنی صورت اور آواز کا جادو جگاتے ہیں لیکن عام آدمی کو ریڈیو اور ٹی۔وی رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اپنی خواتین کو اسمبلیوں اور دفتروں میں بٹھا دیتے ہیں لیکن عام عورتوں کو گھروں سے نہیں نکلنے دیتے۔ اپنی بیٹیوں کو جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں لیکن عام آدمی کی بچیاں جن سکولوں میں جاتی ہیں' انہیں جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔ گر یہ پاکستان اور افغانستان پر قابض ہو گئے تو قدیم تہذیب و تمدن کے وارث ان دونوں ملکوں کے عوام کو قرون اولیٰ کے دور میں پہنچا دیں گے اور ایسے خیالات اور تہذیبی تصورات کے ساتھ ہماری ایٹمی قوت ان کے تصرف میں ہو گی اور یہ اس طاقت کو مہذب دنیا کے خلاف کس طرح استعمال کریں گے' یہ سوچ کر خوف آتا ہے۔

ہمیں یہ بات تسلیم کر لینا چاہئے کہ پاکستانی سیاست' جسے غیر جمہوری قوتوں نے سازش' جوڑ توڑ' خوشامد اور کرپشن میں غرق کر دیا ہے' اس میں سب سے زیادہ ہنرمندی کا مظاہرہ یہ مذہبی سیاستدان کر رہے ہیں۔ وہ حکومت کے اندر ہیں بلکہ اس کی ناک میں نکیل بھی ڈالے بیٹھے ہیں اور اپوزیشن میں بھی معتبر اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ تعداد میں اے آر ڈی سے کم ہونے کے باوجود' قائد حزب اختلاف کی کرسی ان کے قبضے میں ہے۔ یہ حکومت اور اپوزیشن دونوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ دونوں ہی بڑی چاہت اور اشتیاق سے ان کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے ہیں۔ ساری اپوزیشن صدر پرویز مشرف کی وردی اور نیشنل سیکیورٹی کونسل کے خلاف ہے مذہبی سیاستدانوں نے ان دونوں کو تحفظ دیا۔ صدر پرویز مشرف کی وردی اور ۱۷ویں ترمیم کو جائز اور قانونی قرار دینے والے بھی یہی ہیں اور اپوزیشن کی صفوں میں بھی یہی محترم ہیں۔ دوسری طرف حزب اختلاف بن کر یہ حکومت کو دھمکیاں بھی دیتے ہیں اور اس کے سر آنکھوں پر بھی بیٹھے ہیں۔ حکمران جماعت کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین اور پنجاب کے وزیراعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی کی تو ڈیوٹی ہی یہ ہے کہ دن رات ان کے کام کریں۔ ان کی خدمت میں حاضری دیں اور ان کی تلخ و تند باتیں بھی سنیں۔ حکومت اور حزب اختلاف دونوں انہیں سادہ لوح اور سیاسی باریکیوں سے بیگانہ سمجھ کر انہیں کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف مذہبی سیاستدان انتہائی ہوشیاری سے نہ صرف اپنے مقاصد کے لئے ریاستی طاقت کو

استعمال کر رہے ہیں بلکہ آئندہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر اپوزیشن کے نعرے بھی ہتھیا رہے ہیں۔ کسی بھی انتخابی مہم میں سب سے مقبول نعرہ کسی طاقتور غیر منتخب حکمران کے خلاف ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ اور پرشور انداز میں یہ نعرہ مذہبی سیاستدان لگاتے ہیں۔ گزشتہ چند سالہ واقعات کے نتیجے میں امریکہ کے خلاف بھی حزب اختلاف کے تمام لیڈروں سے زیادہ سخت اور شدید نعرے یہی مذہبی سیاستدان لگا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کرنے کی تمام بدنامیاں مسلم لیگ (ق) کے کھاتے میں جا رہی ہیں اور سارے فائدے مذہبی سیاستدانوں کی جھولی میں گر رہے ہیں۔ اسی طرح حکومت کے ساتھ درپردہ سمجھوتوں کی ساری بدنامیاں پیپلز پارٹی کو مل رہی ہیں اور حکومت کو للکارنے کا سارا کریڈٹ مذہبی سیاستدان سمیٹ رہے ہیں۔

حدود بل کے معاملے میں مذہبی سیاستدانوں نے ایسی چالاکیاں دکھائی ہیں کہ حزب اختلاف اور حکومت دونوں اپنی چوکڑی بھول بیٹھے ہیں۔ وہ مذہب کے نام پر حدود کے قوانین پر تو اجارہ داری رکھتے ہی ہیں' اب تعزیری قوانین پر بھی اتھارٹی تسلیم کرانے کے لئے کوشاں ہیں۔ کوشاں کیا ہیں؟ قریباً تسلیم کرا چکے ہیں۔ ان کا اگلا قدم قوانین کے پورے ڈھانچے کو اپنی مرضی کے تحت مرتب کرانا ہوگا۔ جہاں قرآن وسنت کے احکامات واضح ہیں' وہاں تو ان کی اجارہ داری پہلے ہی مانی جاتی ہے اور جہاں انسانی آزادیوں اور سہولتوں کی گنجائش ہو' وہاں یہ اپنی من مانی تشریحات کے ذریعے انسانی حقوق اور آزادیاں سلب کرتے ہیں۔ حقوق نسواں بل کے معاملے میں یہی کچھ کیا جا رہا ہے۔ جنرل پرویز مشرف اور ان کی حامی جماعتوں کو اندازہ ہی نہیں کہ مذہبی سیاستدانوں کے سامنے تعزیری قوانین کے سلسلے میں جو پسپائی وہ اختیار کرنے جا رہے ہیں' اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سے بہتر ہے کہ حدود قوانین کے پتھر کو چوم کے چھوڑ دیا جائے۔ اگر حقوق نسواں بل مذہبی سیاستدانوں کی خواہشات کے مطابق بنا کر پاس کرایا گیا تو یہ عمل حدود آرڈیننس سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ مناسب یہ ہے کہ یورپی یونین اور امریکہ حدود آرڈیننس کے مسئلے پر فوراً پسپائی اختیار کرتے ہوئے معاملے کو یہیں دبا دیں اور صدر پرویز مشرف بھی یہ مہربانی فرمائیں کہ حدود آرڈیننس کا معاملہ آنے والی کسی نمائندہ اسمبلی کی صوابدید پر چھوڑ دیں۔ میں بہت دنوں سے لکھ رہا ہوں کہ مہذب معاشرہ مذہبی سیاستدانوں کے قبائلی معاشرت اور روایات پر مبنی اسلام کے سامنے تیزی سے پسپا ہو رہا ہے۔ اگر جمہوریت مکمل طور سے بحال نہ ہوئی تو کیا عوام اور کیا حکمران؟ سب کو اسلام کے نام پر مذہبی سیاستدانوں کی

بالادستی قبول کرنا پڑے گی۔ ہم تو شاید ایسا کر لیں لیکن دنیا ایسا نہیں ہونے دے گی۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا؟ ہر کوئی آسانی سے قیاس کر سکتا ہے۔ عوامی سیاستدان اور فوج اگر اب بھی ہوش میں نہ آئے تو آنے والی تباہی کے ذمہ دار ہوں گے۔

پاکستان میں اقتدار کی سیاست پر فوج کا غلبہ ایک حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو طاقت سے بدلنا سیاستدانوں کے بس میں نہیں۔ واحد راستہ یہی ہے کہ جس طرح فوج نے اقتدار میں داخل ہو کر سیاستدانوں کو باہر کیا' اسی طرح سیاستدان اقتدار میں داخل ہو کر بتدریج فوج کو سیاست سے باہر کریں اور مذہبی سیاستدانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کے جبر سے عوام کو بچائیں۔ اگر ان دونوں نے ایک دوسرے کو تسلیم نہ کیا تو پھر مستقبل کی جھلک موجودہ صورتحال میں ہی نظر آ رہی ہے کہ حکومت اور اپوزیشن دونوں مذہبی سیاستدانوں کے سامنے بے بس ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لڑائی کا سب سے زیادہ فائدہ انہی کو ہے۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ' لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی مملکت

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔''

(عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، دکن کے طلباء کو انٹرویو)

## قرآنِ کریم کی جامعیت

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبنؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''بحرِ اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں''۔

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:

''اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا۔۔۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان

قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے''۔

(تقاریر۔جلد دوم۔ص ۳۰۰)۔

## تھیاکریسی نہیں ہوگی!

پاکستان' کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار' جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں' ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو' یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہو گی' جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(فروری ۱۹۴۸ء بہ حیثیت گورنر جنرل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ پرچہ چھپنے تک شروع ہو چکا ہو گا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق) قرآن کی رو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(۱) یاایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون o (۲/۱۸۳)۔

''اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرسکو۔''

(۲) ایام معدودات .....

''یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں''۔

(۳) فمن کان منکم مریضا او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر۔

''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے''۔

(۴) وعلیٰ الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین

(۵) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۶) شھر رمضان الذی انزل فیہ القران.....

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(۷) فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضاً او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر

(۱۸۵۔۱۸۳/۲)۔

''لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو.....تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے۔''

(۸) وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی اللیل (۱۸۷/۲)۔

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) احل لکم لیلتہ الصیام الرفث الی نسائکم (۱۸۷/۲)۔

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوگیا کہ:

۱۔ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)۔

۲۔ روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳۔ روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کردے۔

۴۔ اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم، شق نمبر۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

**غور فرمایئے!** اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وعلی الذین یطیقونہ' کا ترجمہ۔۔۔ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں۔۔۔ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ۔۔۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے

کی طاقت رکھتے ہوں۔۔۔کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشاء یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ ''طاقت'' کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ 'طاقت' سے کر دیا۔ ان دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم ص ۱۳۰۴ میں ہے۔

''طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔لا تحملنا مالا طاقتلنا به کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ:

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار ص ۱۵۵ جلد نمبر ۲ میں فرماتے ہیں۔

**اطاقة** دراصل **مکنت** اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب **اطاق الشیئ** صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی دشواری کے ساتھ اسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ **یطیقونه** سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار (عُذر کی جمع) کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے.....اسی بناء پر امام راغبؔ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:

**طاقة** کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور **وعلی الذین یطیقونه** سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی

عورتیں ہیں۔ جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف، ص ۲۵۵، جلد ۱)۔

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

عربی زبان میں **الوسع** کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور **طاقة** کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیرِنظر) کے معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے..... ۔

(روح المعانی، ص ۵۹، جلد ۲)۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ **"طاقة"** کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر **وعلی الذین یطیقون** کا ترجمہ۔۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔۔ کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ۔۔ اور جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں..... کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ **وعلی الذین یطیقونہٗ** میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن"، ص ۲۶۸۔ص ۲۶۹، جلد ۲ میں ہے کہ:

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمے کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی امِ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بمشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا

تیرے ذمے فدیہ ہے قضا نہیں۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

الذین یطیقونہ سے یہاں مراد بوڑھے' ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔

(تفسیر المنار' ص ۱۵۵' ص ۱۵۷' جلد ۲)۔

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے:

۱۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

۲۔ حاملہ عورتیں۔

۳۔ دودھ پلانے والی عورتیں۔

۴۔ اپاہج اور معذور لوگ۔

۵۔ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔

۶۔ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (Constitutionaly) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔

۷۔ وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پر مشقت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے' کارخانوں میں کام کرنے والے وغیرہ۔

۸۔ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے' اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ' آیات نمبر ۱۸۳ تا ۱۸۸)۔

# Ramadan and the Spirit of Thanksgiving

***By***

Mansoor Alam

==========

It seems giving thanks for God's bounty has been practiced since the earliest times. From the ancient Greek Thesmophoria to the Roman Cerealia to the more modern practice of Thanksgiving people have been offering ritual thanks to their various gods in one form or another. All the Biblical Prophets taught their people to be thankful to God for His bounties. Then the Quran came and made a universal declaration that the bounties of God are meant for entire humankind and therefore must not be restricted to a particular nation or a people:

*Of the bounties of thy Lord We bestow freely on all- These as well as those: The bounties of thy Lord are not closed (to anyone). (17:20)* [As translated by Yusuf Ali]

Thus, according to the Qur'an, the entire Earth and its resources are a gift from God and therefore must be treated as sacred. The very opening verse of the Qur'an says: He is the Sustainer of all the worlds (1:1). Therefore, we all must be thankful for this sustenance – always.

But the month of Ramadan has a special significance in Islam most of all because the Qur'an started to be revealed in this month but also because of its month long fasting, and the spirit of thanksgiving.

The Qur'an has mentioned three results of fasting in this month: 1) *Taqwaa* or learning self-restraint (2:183), 2) *Takbir* or glorifying Allah because of being guided, and 3) *Shukr* or thanksgiving (2:185).

Here we focus on the thanksgiving (or *Shukr*) aspect of Ramadan, its meaning, and benefits.

What is the meaning of *Shukr*? Yusuf Ali has translated *Shukr* in verse (2:185) as being grateful. Other translations are: render thanks (Muhammad Asad, Picthall). But none of these translations bring out the true root meaning of *Shukr*. The root meaning of *Shukr* (s*h-k-r)* is for something to become full and complete and to become available to others. *Shakiratun* means a she-camel, ewe, or she-goat having her udder full (Lane's Lexicon page 1585, Book I).

In the Qur'anic verse (2:152) the word *Shukr* has been used in opposition to *Kufr* which in its root means to hide. *Shukr* of Allah therefore is to keep His bounties (*Ni'ma*) open in such a way that everyone is able to derive one's due benefit from them, and that no one hides them from (and thus denies them to) other human beings because that would be *Kufr*. Allah says that His bounties are given to see who does *Shukr* and who does *Kufr* (27:40).

How to do *Shukr* and what benefits accrue from it? Obviously *Shukr* of Allah cannot be done simply by reciting its words on fingers or on the beads of a rosary. It requires human effort. In light of the above root meaning doing *Shukr* of Allah is to work hard ceaselessly and to keep the fruits of that labor open to others. The Qur'an also says that the act of doing (and not reciting the word) *Shukr* develops the self of the person doing the *Shukr* (27:40, 31:12). In other words, it leads to his/her spiritual growth and development.

Since this is not an easy thing to do a definite course must be laid for this purpose. As we know developing our physical abilities requires constant effort and discipline. So it is with developing our human abilities, albeit harder. And so it is with developing our self, only more difficult. Yet developing the self (or soul) is the most important thing for our success in the Hereafter which is what truly counts in the long run. The Qur'an says that those who develop and nourish their souls will succeed (87:14, 91:9) while those who don't will fail (91:10) on the Day of Judgment.

For this purpose, a month-long yearly crash course of fasting and prayer in Ramadan with clearly defined goals and strictly laid guideline of what to do and what not to do to achieve them has been prescribed by Allah for us so that we may develop and strengthen our self (2:183-2:185). This yearly commitment to Ramadan involving our conscious effort and hard work ensures our spiritual development and growth. By a month long training and practice involving self-discipline and self-control Islam wants to instill good habits in its followers.

Good habits facilitate good actions. And good actions reinforce good habits. In this way what seems difficult at first becomes relatively easy to practice in daily life throughout the year. The best thanksgiving that we can render unto Allah is to keep His bounties and the fruits of one's labor open to all – without any discrimination whatsoever based on religion, race, ethnicity, etc. May Allah give us the fortitude to do that.

==========

# THOSE DISGUSTING CARTOONS

*By*
**A.S.K. Joommal**
***(Editor: Al-Balaagh, South Africa)***

==========

Muslims may not be 5-times Namaazis, they may not fast in Ramadaan, nor perform their Hajj, but let anyone insult or speak ill of their Prophet (S)… then the fat will be in the fire, and their vengeful emotions will explode with atomic fury!

This is one of the hallmarks of a Muslim. No one- but NO ONE- must say a single word to denigrate his Nabi, who is nearest and dearest to his heart than even his parents. The frunkard has the same feeling for his Rasool (S), as the sober Muslim!

This is one of the inexplicable phenomena of being a Muslim! You can swear at my parents all you want, but you dare traduce my Prophet (S)! Then all hell will break loose.

And so it happened worldwide recently when that moron of a cartoonist on the Danish newspaper, *Jyllands-Posten*, drew ugly, hugely insulting cartoons of our Nabi (S), and these cartoons were syndicated in all the newspapers throughout Europe. That had a cataclysmic effect! Never in his wildest dreams did the editor of *Jyllands-Posten* imagine the furore and commotion the senseless, stupid cartoons in his paper will cause in the Muslim world, *uniting the entire Ummah (Sunni, Shias, et al) in one solid phalanx!*

## "FREEDOM"

"Freedom" is a very interesting word, and it has multifarious connotations. Freedom of speech and expression are sacrosanct and canonical, and as such they are enshrined in the constitutions of all the democratic governments of the world. Thus it is inviolable. However, we must remember religiously that "freedom" must never, NEVER be confused and/or interchanged with "licence". And this is what the media of the world (particularly the western media) just refuse to comprehend and keep reiterating that they have the freedom to say and think as they please about other people's faiths, cultures and mores.

This is where a line- a moral line- should be drawn. With all their harpings on and barking out the word "freedom", they do not realize that they tread roughshod on the religious susceptibilities of a segment of the world's population- 1,2 billion of them- to whom their religious figures are sacrosanct and inviolable!

Enmity against Islam and Muslims has been rampant for centuries-in fact ever since the advent of this Faith chosen by Allah Almighty. Christians and Jews tried their damndest- and are still trying! – but they cannot extinguish the lamp lit by Allah (SWT) (which is Islam): "They desire to put out the light of Allah with their mouths, and Allah will allow nothing save the perfections of His Light- though the disbelievers are averse." (9:32).

## QURANIC SENTIMENT

A poet echoes this Quranic sentiment in the following couplet:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

*"The Light of the Almighty smiles upon the shenanigans of unbelief;*

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

*This is Lamp (of Allah, i.e. Islam) cannot be put out by blowing on it."*

Muslims have been given the guideline regarding the treatment of other faiths fifteen hundred years ago, when the Almighty enunciated in the Holy Quran: "And abuse not those whom they call upon besides Allah, lest, exceeding the limits, they abuse Allah through ignorance." (6:109) Muslims follow this instruction at most times. Thus one will never find Believers in Allah and Rasool (S) reviling Jesus, Moses, Buddha, Krishna, *et al*. One will NEVER find caricatures a la *Jyllands-Posten* in Muslim newspapers. Muslim editors are far too sensitive and very respectful towards the holy personages of other faiths!

## WESTERN MEDIA

It is, however, left to the insensitive, callous, inimical editors of the western media to choose, out of thousands of available subjects and topics, to pounce on our Beloved Nabi (S) (as Salman Rushdi did!) to cast aspersions on and present him in the worst possible light, e.g. depicting him carrying a bomb in his turban!

Why don't these idiotic cartoonists lampoon and make caricatures of those two shameless LIARS and ruthless TERRORISTS of this era – Bush and Blair? They wouldn't dream of it. Why? Because it is the way of the West to treat saints as Satans, and Satans as saints! However, truth has a habit of bobbing up, no matter how much one tries to suppress it. And the Truth of Islam, the Message of the Quran, and the Teachings of Rasoolullah (S) will ultimately triumph in all their glory and destroy the forces of evil and darkness presently enveloping the world. Insha-Allah!

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے

*"The Divinity has placed resilience in the nature of Islam;*

اتنا ہی یہ اُبھریگا جتنا کہ دَباؤ گے

*It will rise up )again and again) no matter how much it is suppressed."*

**********